عصر حاضر میں
اسلام کے علمی تقاضے

مولانا سیّد جلال الدین عمری

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

۱۹۷۰ء میں ادارۂ تصنیف جماعت اسلامی ہند رام پور سے علی گڑھ منتقل ہوا اور جلد ہی 'ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ' کے نام سے ایک آزاد رجسٹرڈ سوسائٹی کے تحت اپنے دو ایک رفیقوں کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہوگیا۔ اپنی ناتوانی اور بے سر وسامانی کے باوجود یہ خیال مسلسل رہا کہ ادارہ کو ایک علمی مرکز کی حیثیت دی جانی چاہیے۔ اس مقصد سے جنوری ۱۹۸۲ء میں سہ ماہی تحقیقات اسلامی کا اجرا عمل میں آیا۔ اس کے ذریعے کوشش کی گئی کہ آج کے دور میں اسلامی موضوعات پر ریسرچ اور تحقیق کی اہمیت واضح کی جائے، اہم علمی خدمات کا تعارف ہو، اسلام کے عقیدے اور اس کی تعلیمات کے ذیل میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور جن کی وجہ سے اس پر غور و فکر اور مطالعہ کا رخ غلط ہو جاتا ہے، ان کا ازالہ ہو اور اسلامی تحقیق کو صحیح رخ دینے کی سعی کی جائے۔ اس کے لیے اہل علم اور اصحاب قلم سے ربط قائم کیا گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس مقصد میں کسی نہ کسی درجہ میں کامیابی حاصل ہوئی اور تحقیقات اسلامی کا ایک مختصر سا حلقہ وجود میں آگیا اور اسے علمی حلقوں میں بہ نظر اعتبار دیکھا جانے لگا۔

سہ ماہی تحقیقات اسلامی کے آغاز ہی سے اس موضوع پر اس کے خاکسار مدیر نے چند ایک چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے شروع کیے۔ اس وقت انھیں یک جا کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ توقع ہے کہ اسلامی تحقیق کے عمل کو آگے بڑھانے میں یہ معاون ثابت ہوں گے اور ان سے فکر و نظر کو ایک طرح کی تحریک ملے گی۔

اس عاجز نے اپنے ایک خطاب میں جماعت اسلامی ہند کے رفقاء اور وابستگان سے عرض کیا تھا کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا اسلام کی طرف متوجہ ہو اور اس کی

صداقت اور حقانیت کو تسلیم کرے تو اس کے لیے ہمیں علمی اور فکری طور پر تیار ہونا چاہیے اور آج کے علمی سوالات کا جواب دینے کے موقف میں ہونا چاہیے۔ اس سے غفلت اور بے توجہی صحیح نہ ہوگی۔ یہ مضمون ماہ نامہ زندگی نو، نئ دہلی اگست ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ موضوع کی مناسبت سے کسی قدر ترمیم کے بعد اسے اس مجموعہ میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اس سلسلے کے ایک مضمون میں اسلام پر تحقیق اور ریسرچ کے ذیل میں بعض اصولی باتیں عرض کی گئی ہیں۔ ان مضامین کی اشاعت سے پہلے ان پر نظر ثانی میں کہیں کہیں تھوڑا بہت حذف و اضافہ ہوا ہے۔ بعض عنوانات بدل دیے گئے ہیں۔

آج کے دور میں اس بات کی شدید ضرورت ہے اور یہ ضرورت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے کہ مختلف پہلوؤں سے علمی انداز میں اسلام کی حقانیت اور معنویت ثابت کی جائے۔ لیکن یہ بڑی پتہ ماری کا کام ہے۔ اس میں انسان جب بہت ہی خاموشی سے عرصہ تک اپنا خون جگر جلاتا رہتا ہے تب اس قابل ہوتا ہے کہ کسی موضوع پر ذمہ داری کے ساتھ بول سکے۔ ہماری ایک بڑی کم زوری یہ ہے کہ وقتی اور ہنگامی کاموں کے لیے تو ہمارے اندر بڑا جوش اور جذبہ پایا جاتا ہے، لیکن کسی علمی اور سنجیدہ کام کی تحریک نہ تو ہمارے اندر پیدا ہوتی ہے اور نہ اس کی اہمیت محسوس کی جاتی ہے۔ حالاں کہ کوئی بھی قوم محض جوش اور جذبات کے بل پر زندہ نہیں رہ سکتی، اس کے لیے ٹھوس اور مضبوط بنیادوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے افراد امت میں انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، جو مختلف میدانوں میں علمی سطح سے اسلام کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کر سکتے ہوں۔

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی اس کمی کو دور کرنے کی اپنی سی سعی و جہد کر رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے اور اسے صحیح معنی میں ایک علمی مرکز بنانے میں ان سب لوگوں کا تعاون حاصل ہو جو اس کی اہمیت محسوس کرتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے مزید ترقی سے ہم کنار کرے۔

جلال الدین عمری
مارچ ۲۰۱۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور دور جدید کے علمی مطالبات

[ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کے ترجمان سہ ماہی 'تحقیقات اسلامی' کے اجرا کے وقت یہ تحریر لکھی گئی تھی اور مجلّہ کے پہلے شمارے میں 'حرف آغاز' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔]

اسلام نے جہاں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ وہ خالقِ کائنات کا دین ہے، اس کے حق میں مضبوط دلائل بھی فراہم کیے ہیں۔ ان دلائل میں ہر دور کے اونچے سے اونچے انسان کو اپیل کرنے اور اس کے دل و دماغ کو پوری طرح مطمئن کرنے کی بھرپور قوت اور صلاحیت موجود ہے۔ جس طرح ہر شخص کا ایک ذہنی اور فکری سانچہ ہوتا ہے اسی طرح ہر دور کا بھی مخصوص اندازِ فکر ہوتا ہے۔ بہت سے وہ افکار و خیالات جو ماضی میں انسانی فکر پر چھائے ہوئے تھے اور جن پر طول طویل بحثیں ہوتی تھیں، آج ان کی سرے سے کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہی اور ان کی جگہ دوسرے افکار و خیالات نے لے لی۔ افکار و خیالات کی تبدیلی سے مسائل حیات ہی نہیں بدلتے، بلکہ ان کے اظہار کے طریقے بھی بدل جاتے ہیں۔ زبان و بیان، نیا اسلوب اور نئی طرزِ ادا اختیار کرتے ہیں، نئی اصطلاحیں وضع ہوتی ہیں، نئی منطق وجود میں آتی ہے اور بحث و نظر کا نیا انداز اور نیا

ڈھنگ جنم لیتا ہے۔ لوگ اس تبدیلی کے اس قدر عادی ہوجاتے ہیں کہ قدیم اندازِ بیان اور طریقۂ تعبیر ان کے لیے نامانوس اور ناپسندیدہ ہوجاتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر مسئلہ کو اپنے دور کی زبان و بیان ہی میں سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام کو بھی ہر دور کی علمی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور جو سوالات پیدا ہوتے رہے ان کا جواب بھی اس وقت کے استدلالی انداز میں دیا گیا۔ یہ کوشش کسی ایک میدان میں محدود نہیں تھی، بلکہ اس کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ اس میں تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ وغیرہ بہت سے علوم داخل تھے۔ اس سلسلہ میں امت کے علماء، محققین اور مجددین نے جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، اسلامی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ان بزرگوں نے ــــ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے ــــ اسلام کو اپنے عہد کی علمی زبان میں اور اتنے اونچے معیار سے پیش کیا کہ کسی بھی شخص کے لیے یہ کہنا آسان نہیں رہا کہ اسلام ہمارے دور کے علمی اور عقلی معیار پر پورا نہیں اترتا اور اس کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ یہ ان کا اتنا بڑا احسان ہے کہ امت اس سے کسی طرح سبک دوش نہیں ہوسکتی۔

اسلام کی سب سے بڑی خدمت

تاریخ کے اسی عمل کو آج پھر دوہرانے کی ضرورت ہے۔ اس وقت اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اسے دورِ حاضر کی علمی و فکری سطح سے پیش کیا جائے۔ جن افکار و نظریات کی ہر سو حکم رانی ہے، ان کے مقابلہ میں اسلامی نظریات کی برتری ثابت کی جائے اور ان ذہنی و فکری الجھنوں کو اسلام کی روشنی میں حل کیا جائے جن میں آج پوری دنیا گرفتار ہے۔ یہ دیکھ کر دلی مسرت محسوس ہوتی ہے کہ امت میں اس کا احساس جاگ رہا ہے اور کسی نہ کسی درجہ میں اسلام پر بڑی کارآمد اور مفید علمی خدمات انجام پارہی ہیں۔ اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کے پیش نظر کام

'ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی' بھی اس میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ کام اتنا بڑا ہے اور اس کے اتنے مختلف پہلو ہیں کہ بہت سے افراد اور ادارے مل کر بھی اس کا حق ادا نہیں کرسکتے اور نئے نئے اداروں کی بہر حال ضرورت رہے گی۔ ادارہ کی کوشش ہوگی کہ خالص علمی انداز میں اسلام کا وسیع تعارف کرائے، اس کے اخلاقی، روحانی، سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی پہلوؤں پر تحقیقی لٹریچر فراہم کرے، دورِ جدید نے اسلام کی نسبت سے جو سوالات پیدا کیے ہیں ان کا جواب دے اور اسلام کو سمجھنے کی راہ میں آج جو علمی دشواریاں پیش آرہی ہیں انہیں دور کرے۔ یہ کوئی چھوٹا موٹا کام نہیں ہے، بلکہ ایک بڑی علمی مہم ہے۔

اس مہم میں ادارہ ان تمام اصحاب علم اور ارباب قلم کا تعاون چاہتا ہے جو اس سے دل چسپی رکھتے ہیں اور اس کی اہمیت اور افادیت محسوس کرتے ہیں۔ ان کا تعاون ادارہ کے لیے عزت افزائی کا باعث ہوگا اور وہ ان کا بے حد ممنون ومشکور ہوگا۔ یہ کوئی خاک ساری یا تکلف کی بات نہیں، بلکہ حقیقت ہے کہ اسلامی مفکرین کے تعاون ہی سے یہ مہم سر کی جاسکتی ہے۔

اس کام کے لیے جن اعلیٰ علمی صلاحیتوں اور مادی وسائل کی ضرورت ہے، وہ واقعہ یہ ہے کہ ادارہ کو حاصل نہیں ہیں، لیکن اس امید پر کام کا آغاز کردیا گیا ہے کہ جس خدائے ذوالجلال نے اس کی توفیق اور ہمت عطا کی ہے وہ اس کی صلاحیت بھی دے گا اور ضروری وسائل بھی فراہم کرے گا۔ وہ چاہے تو بے مایہ انسانوں سے بھی بڑے سے بڑا کام لے سکتا ہے۔ کوئی بھی چیز اس کے لیے ناممکن نہیں ہے۔ **انه علی کل شیئ قدیر**

مجلّہ تحقیقات اسلامی کا مقصدِ اجرا

'ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی' کے سامنے جو وسیع کام ہے، اسی کا ایک حصہ سہ ماہی، 'تحقیقات اسلامی' کا اجرا بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں بہت سے رسائل اور جرائد چھپتے ہیں، لیکن ان میں بڑی تعداد ان رسائل کی ہے جن کی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے۔ رسائل کی اس لمبی چوڑی فہرست میں صرف دو چار ہی رسائل ایسے ہیں جن کا معیار اونچا ہے اور جو پڑھے لکھے حلقے میں پہنچتے ہیں، ان کے مقالات پر توجہ دی جاتی ہے اور کبھی کبھی وہ نقد و نظر اور بحث و تنقید کا موضوع بھی بنتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک ایسے رسالہ کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کا واحد مقصد یہ ہو کہ اسلام کو دور جدید کے علمی معیار کے مطابق پیش کیا جائے۔ جس کے مقالات اور مضامین سے اسلام کے کسی نہ کسی پہلو کی وضاحت یا اس کے بارے میں کسی غلط فہمی کا ازالہ ہو اور اس کی علمی سطح بھی ایسی ہو کہ اس کے مباحث کو نظر انداز نہ کیا جاسکے۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ 'تحقیقات اسلامی' کو اسی معیار کا مجلّہ بنایا جائے۔ اس کے مقالات اور مضامین کا انداز زیادہ سے زیادہ علمی اور تحقیقی ہو، سطحی اور غیر علمی چیزیں نہ شائع کی جائیں اور جو بات کہی جائے وہ تحقیق کے ساتھ کہی جائے۔

اس بات کی بھی کوشش کی جائے گی کہ اس کے مضامین میں تنوع ہو۔ اللہ نے چاہا تو اس میں قرآن و حدیث کی تشریح بھی ہوگی، اسلام کی روشنی میں مختلف موضوعات پر تحقیق و تنقید بھی ہوگی، عقائد و نظریات سے بھی بحث ہوگی، تاریخ اور سیرت کا مطالعہ بھی ہوگا، اخلاقی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی علوم کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ بھی لیا جائے گا اور خالص فقہی مباحث بھی ہوں گے۔

اللہ کا شکر ہے کہ رسالہ کو بعض اچھے اور نام ور اصحاب قلم کا مستقل تعاون

حاصل ہے۔ اس لیے توقع ہے کہ اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا رہے گا اور اس کا ہر شمارہ پچھلے شمارہ سے بہتر ہوگا۔ ادارہ اپنے ان قلمی معاونین کا شکر گزار ہے۔ اس کے ساتھ ان تمام حضرات سے، جو کسی بھی موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے تحقیق اور تنقید کی خدمت انجام دے رہے ہیں، تعاون کی پر خلوص درخواست ہے۔ رسالہ ان کا اپنا ہے، اس لیے امید ہے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون سے دریغ نہیں کریں گے۔

(سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جنوری-مارچ ۱۹۸۲ء)

ﷺ

عرب ممالک میں اسلامی علوم کا احیاء

اسلامی علوم کی بنیاد تو خلفاء راشدین کے عہد ہی میں پڑ چکی تھی، لیکن ان کا باقاعدہ آغاز اموی دور میں ہوا اور عباسی دور میں انھیں عروج و کمال حاصل ہوا۔ ان ادوار میں کتاب و سنت کی روشنی میں اور ان کے مختلف تقاضوں کی تکمیل کے لیے نئے نئے علوم وجود میں آئے، ان کو مرتب و مدوّن کیا گیا، ان کی شرح و تفسیر کی گئی، ان پر تحقیق و تنقید ہوئی، کھرے اور کھوٹے کو پہچاننے کے اصول وضع کیے گئے اور ان کے انطباق کی آزادانہ اور جرأت مندانہ کوششیں ہوئیں۔ چنانچہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، علم کلام، ادب اور لغت کے بڑے بڑے امام اس دور میں پیدا ہوئے اور مجتہدانہ کارنامے انجام پائے۔

اسی دور میں مسلمانوں نے ان علوم و فنون کی طرف بھی توجہ کی جو یونان، فارس، روم، مصر اور ہندستان وغیرہ میں پائے جاتے تھے۔ چنانچہ منطق، فلسفہ، ریاضی، طب، کیمیا وغیرہ سے متعلق بے شمار تصنیفات عربی میں منتقل ہوئیں۔ ان علوم کو مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ عربی میں منتقل کیا، بلکہ جن ممالک میں یہ وجود میں آئے اور جہاں ان کی نشو و نما ہوئی وہاں ان کے زوال پذیر ہونے کے باوجود انہیں اپنے ہاں زندہ رکھا، ان میں مناسب حذف و اضافہ اور ترمیم و تنسیخ کی اور اپنی مجتہدانہ کاوشوں سے ان میں نئی روح پھونکی۔ مسلمانوں نے ان اجنبی علوم کو اس طرح اپنایا اور انھیں اسلامی رنگ دیا کہ انھیں خاص مسلمانوں کے علوم میں شمار کرنا بے جا نہ ہوگا۔

اسلامی علوم وفنون کا زوال

عباسی سلطنت کے زوال کے بعد اسلامی ملکوں، خاص طور پر عرب ملکوں میں ان علوم وفنون پر بھی زوال آیا، ہر طرف ایک طرح کا جمود چھا گیا، تحقیق کی جگہ تقلید کا دور شروع ہوا۔ سابقہ تحقیقات پر قناعت کا رجحان پرورش پانے لگا اور انھیں حرف آخر سمجھ کر قبول کرلیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ بعد کے ادوار میں بھی ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں جن میں اجتہادی شان تھی، جنھوں نے فکر ونظر کی نئی راہیں نکالیں اور اس علمی سرمایہ میں اضافہ کیا جو ماضی سے ہمیں ملا تھا۔ اگر یہ شخصیتیں پیدا نہ ہوتیں تو امت علمی اور فکری لحاظ سے اب تک عباسی دور ہی میں ہوتی۔ اس اعتراف کے باجود یہ کہنا پڑے گا کہ ابتدائی پانچ چھ صدیوں میں جو وسیع علمی ماحول تھا وہ سکڑنے لگا اور جو اجتہادی فضا تھی وہ باقی نہیں رہی، البتہ کہیں کہیں اسے زندہ رکھنے کی کوشش ضرور ہورہی تھی۔

اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں اس صورت حال میں ایک خاص تبدیلی رونما ہوئی، وہ یہ کہ عرب ممالک پر مغرب کے سیاسی غلبہ کے ساتھ مغرب کے علوم و افکار کی اشاعت بھی شروع ہوئی، دنیا کی دوسری محکوم قوموں کی طرح عرب ممالک نے بھی ان علوم کو مرعوبیت کے ساتھ قبول کیا، اس کی وجہ سے ان میں الحاد اور دہریت آئی، آزادی نسواں کی تحریک چلی، اخلاقی بندشیں ڈھیلی پڑیں، عریانیت اور فحاشی نے راہ پائی، قومیت کے تصور نے زور پکڑا اور ایک عرصہ تک قومیت کا تصور ان پر چھایا رہا۔

عرب ممالک میں علمی تحریک کا آغاز اور اس کے نمایاں پہلو

ان غیر اسلامی رجحانات سے جہاں معاشرہ پر غلط اثرات پڑرہے تھے اور وہ اسلام سے دور ہورہا تھا، وہاں مصر، شام اور عراق وغیرہ میں زبردست علمی حرکت بھی

شروع ہوئی۔ اس کے چند نمایاں پہلو یہ تھے:

۱۔ عربوں نے جدید علوم کی طرف توجہ کی، ان سے استفادہ کیا اور انھیں عربی زبان میں منتقل کیا۔ بعض موضوعات پر انھوں نے جدید علوم کا اتنا ذخیرہ فراہم کردیا کہ اس کی بنیاد پر تحقیقی کام ہوسکتا ہے۔ اس طرح عربی زبان نئے افق سے آشنا ہوئی، اسے نئے موضوعات ملے اور نئے مسائل پر اس میں بحث وتمحیص شروع ہوئی۔

۲۔ عربی زبان، جو کئی صدیوں سے جمود کا شکار تھی، اسے نئی زندگی، قوت اور توانائی ملی، اس میں ایسے اصحاب قلم اور ناقد پیدا ہوئے جن کی نظر زبان کی نزاکتوں اور باریکیوں پر بڑی گہری تھی اور جن کی نگارشات نے عباسی دور کے ادیبوں کی یاد تازہ کردی۔

۳۔ قرآن، حدیث، فقہ، سیرت، لغت، ادب، فلسفہ وکلام وغیرہ پر ہمارے اسلاف کی بہترین علمی کاوشیں، جو مخطوطات کی شکل میں پوری دنیا میں بکھری ہوئی تھیں، ان کی طباعت واشاعت کا انتظام ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان تصنیفات کو جس محنت، تلاش وجستجو، تحقیق وتنقید اور دیدہ دری کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ ان سے استفادہ آسان ہوگیا ہے، بلکہ ان کی قدر وقیمت متعین کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

۴۔ اس مدت میں مختلف علوم پر کئی ایک Encyclopedias اور معاجم لکھے گئے۔

اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بہت سے کام عرب قومیت کے جذبہ کے تحت انجام پائے، ان سے اسلامی فکر کی صحیح معنی میں ترجمانی نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامیات پر کام کرنے والوں کو ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔

۵۔ اس پوری مدت میں خالص دینی موضوعات پر بھی بڑا ٹھوس اور قیمتی کام ہوتا رہا ہے۔

جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کا کردار

عرب دنیا میں صحیح معنی میں اسلامی علوم کے احیاء کی تحریک سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے ذریعہ شروع ہوئی۔ جمال الدین افغانی کی تگ و دو کا اصل رخ سیاسی تھا۔ انھوں نے علمی میدان میں بڑی خدمات تو انجام نہیں دیں، لیکن ان کی وجہ سے علمی بیداری ضرور پیدا ہوئی۔ جمال الدین افغانی کی صحبت ہی نے شیخ محمد عبدہ کے اندر احیائے اسلام کا جذبہ پیدا کیا۔ وہ بلند پایہ عالم دین بھی تھے اور نکتہ رس ادیب بھی۔ وہ ادب اور اسلامی علوم دونوں میں تجدید چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے قدیم نصاب تعلیم میں اصلاح کی اور اپنے نہج پر درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ انھوں نے جو مقالات لکھے ان میں مخالفین کے اعتراضات کے جوابات بھی تھے، دین کی صحیح ترجمانی بھی تھی اور اعلیٰ ادب بھی تھا۔ انھوں نے 'نہج البلاغۃ' کی شرح لکھ کر ادب کو ایک نیا رخ دیا۔ 'رسالۃ التوحید' کے ذریعہ جدید علم کلام کی بنیاد رکھی۔ طلبہ کے لیے قرآن شریف کے آخری پارہ کی تفسیر لکھی۔ شیخ محمد عبدہ جدید و قدیم کا امتزاج چاہتے تھے۔ وہ قدیم علوم اور نئے رجحانات دونوں سے واقف تھے اور قرآن کی روشنی میں ان سے بحث کر سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں بعض اوقات وہ قدیم علماء و مفسرین سے اختلاف بھی کرتے تھے۔ انھوں نے اسی نہج پر قرآن مجید کا درس شروع کیا۔ علامہ سید رشید رضا نے اس درس کے جو نوٹس لیے تھے ان کی بنیاد پر اپنی مشہور تفسیر المنار لکھی، جو بارہ ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ یہ تفسیر گو مکمل نہیں ہوئی اور صرف بارہ پاروں کی لکھی جا سکی، لیکن وہ اسلامی علوم کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس میں لغت اور زبان کے مسائل سے بھی بحث ہے، روایات کی صحت اور ضعف پر بھی گفتگو ہے، جمود اور تعطل پر تنقید بھی ہے اور اجتہاد کی دعوت بھی۔ مخالفین کے اعتراضات کا جواب بھی ہے اور مسائل کی تنقیح و توضیح بھی۔ اسے دور جدید کی پہلی اہم تفسیر کہا جا سکتا ہے۔

اسلامی علوم کے احیاء کی کوششیں

(الف) تفسیر

اسی دور میں احمد مصطفیٰ مراغی اور محمد جمال الدین قاسمی کی ضخیم تفسیریں شائع ہوئیں، جو بڑی حد تک ان ہی مقاصد کی تکمیل کرتی ہیں جو المنار کے مقاصد ہیں۔علامہ طنطاوی کی تفسیر الجواہر تیس جلدوں میں اسی دور میں چھپی۔ انھوں نے قرآن مجید کو جدید سائنسی تحقیقات اور عقلی علوم سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ بعض کم زوریوں کے باوجود امام رازی کی تفسیر کبیر کے بعد یہ اپنی نوعیت کی دوسری اہم کوشش تھی۔

ماضی قریب میں سید قطب شہیدؒ نے آٹھ ضخیم جلدوں میں 'فی ظلال القرآن' لکھی۔ وہ جدید ذہن کی الجھنوں اور اس کے فکری و عملی مسائل سے براہ راست واقف تھے اور اسلام کی طرف سے اس کا جواب دے سکتے تھے۔ اپنی اس تفسیر اور دوسری تصنیفات میں انھوں نے یہی خدمت انجام دی۔ عالم عرب کے نوجوانوں کو اسلام کی طرف متوجہ کرنے میں ان کی تصنیفات نے غیر معمولی کردار ادا کیا۔

(ب) حدیث

اس دور میں بڑے بڑے محدثین بھی پیدا ہوئے۔ 'مسند احمد' حدیث کا ایک دائرۃالمعارف ہے، جو چھ ضخیم جلدوں میں ہے۔ امام احمدؒ کو جن صحابہ کی روایات ملیں ان میں سے ہر ایک کی روایات کو انھوں نے الگ الگ جمع کردیا ہے۔ اس میں کوئی خاص ترتیب ان کے پیش نظر نہیں تھی۔ پھر یہ کہ انھوں نے صرف صحیح روایات ہی کو جمع کرنے کا اہتمام نہیں کیا، بلکہ جو بھی احادیث کسی صحابی سے روایت کی گئیں ان سب کو کتاب میں لے لیا۔ اس وجہ سے مسند احمد میں کسی موضوع سے متعلق روایات کا تلاش کرنا اور ان کی صحت پر اطمینان کرنا بہت مشکل تھا۔ اسی وجہ سے قدیم مصنفین میں بھی چند ہی ایسے ہیں جنھوں نے مسند سے براہ راست استفادہ کیا ہو۔ اس کی روایات کی شرح و

تفسیر اور تحقیق وتنقید پر تو بہت ہی کم کام ہوا تھا۔ اس دور میں شیخ احمد عبدالرحمٰن البنا اور شیخ احمد محمد شاکر جیسے چوٹی کے محدثین نے اس کی طرف توجہ کی، احمد عبدالرحمٰن البنا نے پوری کتاب کو الفتح الربانی کے نام سے فقہی ابواب کے لحاظ سے مرتب کیااور اس کی مختصر اور جامع شرح بھی 'بلوغ الامانی من اسرار الفتح الربانی' کے عنوان سے لکھی، جو چوبیس (۲۴) اجزاء میں شائع ہوچکی ہے۔

احمد محمد شاکر نے مسند احمد کی ترتیب کو بدلے بغیر ایک ایک روایت کی سند پر بحث کی۔ اگر یہ روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں یا خود مسند میں دوسرے مقامات پر مختصر یا مفصل آئی ہے تو اس کی نشان دہی کی ہے اور روایت کے مشکل مقامات کو حل بھی کیا ہے۔پھر ہر جلد کے آخر میں ایسی فہرستیں مرتب کردی ہیں کہ اس سے فقہی نقطہ نظر سے بھی استفادہ آسان ہوگیا ہے۔ اسے جدید ریسرچ اور تحقیق کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ اسے وہ تکمیل کو نہیں پہنچا سکے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد بعض دوسرے اصحاب قلم نے اسی نہج پر اسے مکمل کیا ہے۔ اور وہ بیس جلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔احمد محمد شاکر نے جامع ترمذی پر بھی اسی نوعیت کا کام شروع کیا تھا، جو شاید مکمل نہیں ہوسکا۔ لیکن جو جلدیں شائع ہوچکی ہیں اس میں ان کا محدثانہ انداز پوری طرح موجود ہے۔

شیخ ناصر الدین البانی اس دور کے چوٹی کے محدث ہیں۔اسماء الرجال پر ان کی جتنی وسیع نظر تھی، قدماء میں بھی اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ انھوں نے بعض اوقات اس فن کے ماہرین کی بھی گرفت کی ہے۔ان کی 'سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ'، اور 'سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ' اپنے اپنے موضوع پر معرکہ کی کتابیں ہیں۔ انھوں نے مستقل تصنیفات کے علاوہ کئی ایک کتابوں کو ایڈٹ کیا اور ان پر محدثانہ طریقہ سے بحث کی ہے۔ ان کا انداز بعض اوقات سخت ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی بحث وتنقید بڑی وزنی اور جان دار ہوتی ہے۔

اسی طرح محمد فؤاد عبدالباقی ، عبدالقادر الارناؤط، شعیب الارناؤط اور زہیر

الشاویش وغیرہ نے حدیث کی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔

ان سب حضرات کی فن حدیث، رجال اور شروح حدیث پر بڑی وسیع اور گہری نظر رہی ہے۔ انھوں نے عرب دنیا میں یہ رجحان پیدا کیا کہ حدیث جب پیش ہو تو حوالہ کے ساتھ پیش ہو اور اس کی صحت وضعف پر ضرور بحث ہو۔

(ج) فقہ و اصول فقہ

فقہ اور اصول فقہ پر بھی اس دور میں غیر معمولی کام ہوا۔ قدیم فقہ کو ازسر نو مرتب کرنے کی کوشش کی گئی۔ فقہ کے قدیم مآخذ کی جدید طرز پر فہرستیں اور انڈکس تیار ہوئے۔ جیسے ابن حزم کی المحلیٰ اور ابن قدامہ کی 'المغنی' کے انڈکس۔ اس کے علاوہ مختلف مسائلِ فقہ پر، جن میں جدید مسائل بھی شامل ہیں، بڑا علمی اور تحقیقی کام ہوا۔ اصول فقہ کے مباحث ، کتاب، سنت ، قیاس، اجماع، عرف، مصالح وغیرہ پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ اس میں کسی ایک فقہ یا مسلک کی پابندی کی جگہ سب ہی مسالک کو سامنے رکھا گیا اور آزادانہ بحث کے ذریعہ صحیح نقطہ نظر معلوم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کام عرصۂ دراز سے ہمارے یہاں بند تھا۔ عرب مصنفین نے گویا دوبارہ اسے شروع کیا۔

(د) سیرت و تاریخ

سیرت اور تاریخ عرب مصنفین کا خاص موضوع رہا ہے۔ ہمارے قدیم مورخین واقعات کو سنین کی ترتیب سے بیان کرتے ہیں۔ اس کا نقص یہ تھا کہ واقعات کا تسلسل نہیں رہتا اور اس کے اسباب وعلل پوری طرح سامنے نہیں آتے، پھر یہ کہ کسی دور کے تہذیب وتمدن اور معاشرت وغیرہ سے بھی براہ راست بحث نہیں ہوتی تھی۔ دور جدید میں شیخ محمد خضری نے اس طرف توجہ کی اور تاریخ الامم الاسلامیۃ کے نام سے اپنے محاضرات کی تین جلدیں لکھیں، جن میں دور رسالت سے بنوعباس کے زوال تک بحث تھی، نور الیقین فی مناقب سید المرسلین اور 'اتمام الوفاء فی مناقب الخلفاء' کے نام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے حالات الگ سے بھی لکھے، 'تاریخ

التشریع الاسلامی' کے نام سے فقہ اسلامی کی تاریخ مرتب کی۔ خضری کے بعد احمد امین نے 'فجر الاسلام'، 'ضحیٰ الاسلام' اور 'ظہر الاسلام' کے نام سے اسلام کی علمی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ تفصیل سے لکھی۔ احمد امین مورخ بھی تھے اور ادیب بھی۔ان کے اچھوتے انداز تحریر نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا، البتہ ان کے نقطۂ نظر سے پوری طرح اتفاق کرنا مشکل ہے۔ وہ مستشرقین سے بڑی حد تک مرعوب تھے۔لیکن احمد امین ہی کے معاصرین میں یا ان کے کسی قدر بعد لکھنے والے ایسے اصحاب قلم پیدا ہوئے جنھوں نے اسلامی تاریخ کو صحیح رنگ میں دیکھنے کی کوشش کی۔

دور جدید کے عرب مصنّفین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم' خلفاء راشدین، صحابہ کرام، ائمہ فقہ، علماء و متکلمین اور اسلام کی بڑی بڑی شخصیتوں پر اتنا کچھ لکھا ہے اور اس قدر تحقیقی انداز میں لکھا ہے کہ اس کی قدر و قیمت شاید عرصہ تک باقی رہے گی۔

اس کے علاوہ اسلام کے سیاسی، قانونی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی، علمی اور اخلاقی پہلوؤں پر جو زبردست لٹریچر فراہم کیا گیا ہے اس کی تفصیل کے لیے مستقل تصنیف کی ضرورت ہوگی۔

ہماری زبان میں اسلامیات پر جو علمی کام ہوا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن عربی زبان میں جو قدیم علمی ذخیرہ ہے اس سے قطع نظر تحقیق اور ریسرچ کے میدان میں دور جدید کے عرب مولفین ہم سے کافی آگے نظر آتے ہیں۔ افسوس کہ اسلامیات پر ہمارے کام کرنے والے بھی اس سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ جب تک قدیم و جدید سرمایہ پر نظر نہ ہو ریسرچ اور تحقیق کا کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔

(سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اپریل-جون ۱۹۸۲ء)

8003

اسلامی علوم میں اقدامی رجحان

افراد کی طرح قومیں بھی ایک دوسرے کے علوم وفنون اور افکار و خیالات سے استفادہ کرتی ہیں۔ اس استفادے کو غلط اور ناجائز نہیں کہا جاسکتا، بلکہ یہ بعض پہلوؤں سے مفید اور قومی زندگی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اس استفادہ کا انداز اور اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ہر قوم اپنی ذہنی ، فکری، ملی اور سیاسی حالت کے لحاظ سے دوسروں سے استفادہ کرتی ہے۔ جس قوم کی فکری بنیاد مستحکم ہوتی ہے، جسے اپنے نظریات اور افکار پر پختہ یقین ہوتا ہے اور جو کارزارِ حیات میں قائدانہ حیثیت کی مالک ہوتی ہے، وہ دوسروں کے علم وفن اور تحقیق و تجزیہ کو آنکھیں بند کر کے نہیں قبول کرتی بلکہ وہ ان میں سے ہر چیز پر ناقدانہ نظر ڈالتی اور ان کے حسن و قبح کو اچھی طرح دیکھتی ہے، پھر جس بات کو صحیح اور اپنے لیے مناسب اور موزوں خیال کرتی ہے اسے قبول کرتی ہے اور جس بات کو غلط اور نامناسب تصور کرتی ہے اسے رد کردیتی ہے۔ لیکن جب اس کی فکری اساس کم زور پڑجاتی ہے اور اسے اپنے خیالات پر وہ اعتماد نہیں ہوتا جو اسے ہر رطب ویابس کے قبول کرنے سے روکے، تو وہ ہر نئے فکر وخیال پر اندھوں کی طرح ٹوٹ پڑتی ہے، بلکہ اپنے نظریات سے دست بردار ہوکر دوسروں کے نظریات کو اختیار کرنے میں ایک طرح کا فخر اور خوشی محسوس کرتی ہے۔ اسے اپنے ہیروں اور جواہر پر بھی شرم محسوس ہوتی ہے اور دوسروں کے خزف ریزوں کو حسرت اور رشک سے دیکھتی ہے۔

یونانی علوم سے مسلمانوں کا تعلق

مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں یونانی علوم سے فائدہ اٹھایا اور ماضی قریب میں مغربی علوم سے استفادہ کیا۔ لیکن چونکہ ان دونوں ادوار میں ان کی ملّی، سیاسی، ذہنی اور نفسیاتی کیفیت مختلف تھی اس لیے ان کے استفادہ کا انداز بھی بدلا ہوا تھا۔ یہاں ہم اسی کا تھوڑا سا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں:

۱۔ مسلمانوں میں یونانی علوم جس وقت منتقل ہوئے، اس میں شک نہیں کہ ایک طبقہ ان سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے ان علوم کا مرعوبیت کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اس نے اسلام کی روشنی میں ان نظریات کا جائزہ لینے کی جگہ ان نظریات کی عینک سے اسلام کو دیکھا اور اسلام کو ان سے ہم آہنگ کرنے کی نامرغوب و نامعقول کوشش کی۔ لیکن یہ بہت ہی چھوٹا سا طبقہ تھا۔ عام مسلمانوں پر اس کا کوئی خاص اثر نہ تھا۔ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کو اسلام اور اس کی تعلیمات پر پورا پورا ایمان و یقین تھا۔ وہ ابھی کسی غیر اسلامی فکر کو قبول کرنے کے لیے ذہناً تیار نہ تھی۔ اس میں اس کی بھرپور صلاحیت بھی تھی کہ کسی بیرونی فکر کا صحیح طریقہ سے جائزہ لے کر اس کے قابل قبول یا ناقابل قبول ہونے کا فیصلہ کر سکے۔

۲۔ مسلمان سیاسی طور پر حکم راں تھے، اس لیے ان میں وہ ذہنی پستی یا مرعوبیت نہیں تھی جو بالعموم محکوم اور زیردست قوموں میں ہوتی ہے ، یونان کی حیثیت مسلمانوں کے لیے حاکم قوم کی نہیں تھی۔ انھوں نے یونانی علوم کو اس نظر سے نہیں دیکھا جس نظر سے ایک محکوم قوم حاکم قوم کے نظریات کو دیکھتی ہے، بلکہ انھوں نے ایک ایسی قوم کی کی حیثیت سے ان کا مطالعہ کیا جسے دنیا کی تمام قوموں پر سیاسی تفوق اور برتری حاصل تھی۔ وہ دنیا کو درس دینے کی پوزیشن میں تھی۔ ابھی ان سے درس لینے کے لیے تیار نہ تھی۔

۳۔ یونانی علوم نے جو بحثیں چھیڑی تھیں ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، وحی و رسالت، حشر ونشر، مادہ و روح، جبر و قدر اور اسی نوعیت کے مابعد الطبیعیاتی مسائل سے تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مسائل اہم ہیں اور ان کا پوری زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یونانی علوم کا اسلام کی تہذیب، معاشرت، اخلاق، سیاست اور قانون وغیرہ سے براہ راست تصادم نہیں تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ یونانی علوم کا حملہ اسلام کے عقائد پر تھا، اس کی سیاسی و اجتماعی زندگی پر نہیں تھا۔ اس لیے زندگی کے یہ گوشے اس کے اثرات سے بڑی حد تک محفوظ تھے۔

۴۔ یونانی علوم سے مسلمانوں نے گہری واقفیت حاصل کی، ان پر عبور حاصل کیا اور ان کی ایسی مستند توضیح و تشریح کی کہ اس پر پورا اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ یہی نہیں، مسلمانوں نے ان علوم پر بے لاگ نقد و تبصرہ کیا، کھرے کھوٹے کو پرکھا اور اس بات کی نشان دہی کی کہ ان سے ایک مسلمان کس حد تک فائدہ اٹھاسکتا ہے۔ اس طرح یہ علوم مسلمانوں میں جہاں اپنی صحیح شکل میں پھیلے وہیں ان کی افادیت و عدم افادیت کے پہلو بھی ساتھ ہی ساتھ واضح ہوتے رہے۔

۵۔ مسلمانوں میں ایسی شخصیتیں بہ کثرت پیدا ہوئیں جو ایک طرف یونانی علوم پر وسیع اور گہری نظر رکھتے تھے اور دوسری طرف اسلامی علوم میں بھی انھیں تجدید و امامت کا مقام حاصل تھا۔ انھوں نے یونانی علوم کی زد اسلام کے جن عقائد پر پڑ رہی تھی ان کا علمی اور تحقیقی اسلوب میں جواب دیا اور اس طرح اسلام کی حقانیت ثابت کی کہ یونانی علوم کے کسی بڑے سے بڑے معتقد کے لیے بھی اس کی تردید آسان نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یونانی علوم کا زہر مسلمانوں میں پھیلا تو اس کا تریاق بھی ساتھ ہی ساتھ فراہم ہوتا چلا گیا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی عقائد پر جو وسیع لٹریچر مسلمانوں نے فراہم کیا اس سے ہٹ کر بھی علمائے اسلام نے قرآن، حدیث، فقہ کے مسائل سے بحث کرتے ہوئے ان غلط خیالات کی قدم قدم پر تردید کی ہے جو یونانی

علوم کے زیر اثر مسلمانوں میں پھیل رہے تھے اور جن کی وجہ سے ایمان و یقین متزلزل ہوسکتا تھا۔

مغربی علوم سے مسلمانوں کی مرعوبیت

مغربی علوم مسلمانوں میں جب آئے تو حالات بدل چکے تھے:

(۱) یہ علوم مسلمانوں میں اس وقت آئے جب کہ انھیں اپنے عقائد پر وہ یقین نہ تھا جو دورا دل کے مسلمانوں کو تھا۔ دین کا واضح تصور ان کے ذہنوں سے اوجھل ہورہا تھا۔ وہ مختلف قسم کے اوہام و خرافات میں گرفتار تھے۔ ان کی سیرت و کردار میں وہ پاکیزگی باقی نہیں رہی تھی جو اسلام نے عطا کی تھی۔ دین سے علمی وفکری بے خبری اور عملی دوری نے اس بات کو آسان بنادیا تھا کہ کوئی بھی فلسفہ انھیں اپنی جگہ سے ہٹا دے۔ چنانچہ مغربی علوم کا سیلاب آیا تو وہ اس سے بری طرح متاثر ہوئے۔ یونانی علوم سے ان کا تاثر محدود دائرے میں تھا اور مغربی علوم نے انھیں وسیع پیمانہ پر متاثر کیا۔

(۲) مغربی علوم کی حیثیت ایک حاکم قوم کے علوم کی تھی۔ مسلمان مغرب کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے ان سے ذہنی طور پر مرعوب تھے۔ انھوں نے اسی مرعوبیت کے ساتھ مغربی علوم سے استفادہ کیا۔ وہ مغرب کے کسی خیال اور فلسفہ کے بارے میں یہ سوچنے کے لیے آمادہ نہ تھے کہ وہ غلط ہوسکتا ہے، اس لیے مغرب نے اسلام پر جس پہلو سے بھی اعتراض کیا وہ اسے صحیح سمجھنے لگے۔

(۳) یونانی علوم نے بعض خالص عقلی مسائل چھیڑے تھے، لیکن مغرب نے پوری زندگی سے بحث کی اور اسے ایک خاص رخ دینا چاہا۔ اس نے مسلمانوں کے عقائد ہی کو نہیں، ان کی تہذیب، معاشرت، سیاست، قانون، غرض ان کے پورے دین اور پوری تاریخ کو نشانہ بنایا۔ اسلام نے زندگی کے جس پہلو سے متعلق جو ہدایات بھی دیں ان کا مذاق اڑایا اور آج کے دور کے لیے اسے ناقابل قبول قرار دیا۔

(۴) مغربی فکر خالص عقلی فلسفہ کا نام نہ تھا، بلکہ اس کے ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کی ایک دنیا وجود میں آئی، جس نے پرانی دنیا کو اور اس کے مسائل کو بڑی حد تک تبدیل کردیا۔ ان حالات میں اسلام کی طرف رجوع کرنے اور اس سے راہ نمائی حاصل کرنے کا حوصلہ بھی شاید کم ہی لوگ اپنے اندر پاتے تھے۔

(۵) مسلمانوں میں یونانی علوم کے ماہرین تو بہت پیدا ہوئے، لیکن ایسے افراد شاذ و نادر ہی تھے جنھوں نے مغربی فکر و فلسفہ کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہو اور جو اس کے مستند شارح اور ترجمان سمجھے جاتے ہوں۔ ایسے لوگ تو اور بھی کم تھے جن کی مغربی علوم پر ناقدانہ نظر ہو اور جو ان کی خوبیوں اور خامیوں کا خود مغرب کے معیار کے مطابق تجزیہ و تحلیل کرسکیں۔

(۶) یہاں ایک خلا اور بھی پیدا ہوگیا تھا۔ وہ یہ کہ دورا دل میں اسلامی علوم کے ماہرین اور مجددین یونانی علوم پر بھی پورا عبور رکھتے تھے۔ وہ بجا طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ یونانی علوم کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا اسلام کی طرف سے جواب دیں۔ جس طرح دینی علوم میں ان کی دقتِ نظر کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا اسی طرح یونانی علوم میں ان کی گہری بصیرت سے بھی انکار ممکن نہ تھا۔ لیکن مغربی علوم کے آنے کے بعد مسلمان اہل علم دو طبقوں میں بٹ گئے۔ ایک وہ جو مغربی علوم پڑھتا پڑھاتا تھا اور اس سے مرعوب و متاثر تھا، دوسرا وہ جو دینی علوم کی درس و تدریس میں لگا ہوا تھا۔ مختلف اسباب کی بنا پر دونوں کے مطالعہ و تحقیق کے میدان ایک دوسرے سے الگ تھے۔ جو لوگ مغربی علوم پڑھ رہے تھے وہ دینی علوم سے ناواقف تھے اور دینی علوم کے ترجمان مغربی افکار و مسائل سے بے خبر تھے۔ نہ تو پہلا طبقہ اسلام کی صحیح ترجمانی کرسکتا تھا اور نہ دوسرا طبقہ مغربی افکار کے جائزہ اور تنقید کی پوزیشن میں تھا۔ جو لوگ صحیح معنیٰ میں اسلام کی طرف سے جواب دے سکتے تھے وہ مغربی فکر، اس کے اٹھائے ہوئے سوالات اور سائنسی دور کی پیچیدگیوں کو پوری طرح نہیں سمجھتے تھے اور جو مغربی فکر سے واقف تھے اسلام کے بارے

میں ان کی معلومات محدود، ناقص، بلکہ غلط در غلط تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب کی طرف سے اسلام پر تابڑ توڑ حملے ہوتے رہے اور اسلام کی صحیح معنوں میں ترجمانی نہیں ہو سکی۔

اس میں شک نہیں، بعض لوگوں نے مغرب کے اعتراضات کا جواب دینے کی بھی کوشش کی، لیکن یہ لوگ سخت مرعوبیت کا شکار تھے۔ ان کے نزدیک غلط اور صحیح کا پیمانہ مغرب تھا۔ حق وہ تھا جسے مغرب حق کہے اور جس بات کو مغرب کی سند حاصل نہ ہو وہ باطل تھی۔ وہ ان تعلیمات کے ذکر سے بھی شرمندگی محسوس کرتے تھے جن پر مغرب کو اعتراض تھا اور ان کی ایسی رکیک تاویلات کرنے سے بھی گریز نہ کرتے جن سے ان تعلیمات کا حسن ہی ختم ہو جائے۔ وہ اسلام کو مغرب کے تابع دیکھنا چاہتے تھے، چاہے اس کے لیے انھیں اسلام کی صورت ہی مسخ کیوں نہ کرنی پڑے۔

حالات کا رخ بدل رہا ہے

ان حالات میں زمانہ کی رفتار کے ساتھ بعض خاص تبدیلیاں رونما ہوئیں:

(۱) مغربی تہذیب کے عروج کے ساتھ اس کی خامیاں اور اس کے نتائج بھی سامنے آنے لگے۔ یہ نتائج بعض پہلوؤں سے اتنے گھناؤنے تھے کہ خود مغرب چیخ اٹھا۔ اس کی وجہ سے مغربی تہذیب کا طلسم ٹوٹنے لگا، اس کے ارفع و اعلیٰ اور مکمل ہونے کا تصور کم زور پڑتا چلا گیا اور وہ مرعوبیت جو ذہنوں پر قائم تھی کم ہونے لگی۔

(۲) مغربی فکر کے غلبہ کی ایک وجہ مسلمان ملکوں پر اس کا سیاسی غلبہ بھی تھا۔ یہ غلبہ بیسویں صدی میں عملاً ختم ہونے لگا تو مغرب کے افکار کی حیثیت حاکم قوم کے افکار کی نہیں رہی۔ اب اس کے بارے میں زیادہ صحیح طریقہ سے سوچا جانے لگا اور مرعوبیت کی جگہ بے لاگ تجزیہ نے لے لی۔

(۳) مسلمانوں میں ایسے افراد پیدا ہونے شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ ان

کی تعداد بڑھنے لگی جو اسلام کے صحیح علم کے ساتھ مغرب کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جس اعتماد کے ساتھ اسلام کی ترجمانی کر سکتے تھے اسی اعتماد کے ساتھ مغرب کے بارے میں بھی بول سکتے تھے۔ انھوں نے باخبر افراد کی طرح مغرب پر تنقید کی اور اسلام کو پوری جرأت اور ہمت کے ساتھ پیش کیا۔

(۴) اس کے ساتھ ایک اہم تبدیلی یہ آئی کہ مسلمانوں میں اسلام کے احیا کا جذبہ مختلف شکلوں میں ابھرا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اسلام ہی ان کی مشکلات اور مسائل کا حل ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مغربی فکر کے اثرات کو دل و دماغ سے نکالا جائے اور اس کی جگہ اسلام کی برتری کا نقش بٹھایا جائے۔ چنانچہ آج یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں اسلام سے وابستگی بڑھ رہی ہے اور وہ مغرب کو محض ایک سراب سمجھ رہے ہیں۔

اس طرح اسلام کی ترجمانی اب دفاعی دور سے نکل کر اقدامی دور میں داخل ہوچکی ہے۔ امید ہے، یہ دور اور ترقی کرے گا اور اسلام اپنی صحیح شکل میں زیادہ سے زیادہ نکھرتا چلا جائے گا۔

(سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۸۲)

ꙮ

اسلام کے مطالعے کے اُصول و شرائط

ایک زمانہ تھا جب کہ اسلام کا مطالعہ بڑی حد تک دینی مدارس اور قدیم علماء کے درمیان محدود تھا۔ اس سے ہٹ کر معدودے چند مستشرقین نے بالعموم اپنے مذموم مقاصد کے تحت اس کی طرف توجہ کی۔ اب یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ وہ ایک وسیع دائرہ میں زیر بحث آچکا ہے۔ ہمارے دانش ور اور مفکرین بھی اس سے دلچسپی لے رہے ہیں، یونیورسٹیوں اور جدید درس گاہوں میں اس کی درس و تدریس ہو رہی ہے۔ مختلف اسلامی موضوعات پر غور و فکر اور بحث و مباحثہ جاری ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ آج کے دور میں اسلام کی کیا معنویت اور افادیت ہے؟ اور زندگی کے پیچیدہ مسائل میں وہ ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے؟ یہ بات بھی بڑی قابل قدر ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ، جو ہر چیز کو مغرب کی عینک سے دیکھنے کا عادی رہا ہے اور جس نے کبھی اسلام کی طرف توجہ بھی کی تو مستشرقین کے زیر اثر کی، اب اس کے نقصانات کو محسوس کرنے لگا ہے اور آزاد علمی فضا میں اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ خود مستشرقین کا اسلام کے مطالعہ کی طرف صرف یہی نہیں کہ رجحان بڑھ رہا ہے، بلکہ ان کے مطالعہ میں طنز و تعریض اور تحقیر کی جگہ کسی قدر سنجیدگی نمایاں ہوتی جا رہی ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے مطالعہ کے سلسلے میں ان جدید مفکرین کی طرف سے بعض بنیادی باتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، یا یہ کہ ان کی اہمیت نہیں محسوس کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے یہ مطالعہ ناقص اور ادھورا ہی نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات اس سے اسلام کے بارے میں شدید غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اعتراضات اور جوابات کا ایک طویل سلسلہ چل پڑتا ہے۔ یہاں ہم اسلام کے تفصیلی اور تحقیقی مطالعہ کے لیے بعض اصول و شرائط کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

عربی زبان سے اچھی واقفیت ضروری ہے

ا- ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام کے بنیادی مآخذ ــــ قرآن اور حدیث ــــ عربی زبان میں ہیں۔ اسلام کے تفصیلی مطالعہ کے لیے اس زبان سے، اس کے الفاظ سے، ان کے در و بست سے، اس کے اسلوب اور اندازِ بیان سے اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے۔ قرآن اور حدیث کی زبان کلاسیکی اور اس قدر معیاری ہے کہ ان کا مقابلہ عربی ادب کی کوئی تحریر آج تک نہ کرسکی۔ ان کے لفظ لفظ میں معانی کی ایک دنیا آباد ہے۔ عربی زبان کی اعلیٰ صلاحیت کے بغیر آدمی ان باریکیوں کو سمجھ نہیں سکتا جو ان کے اندر موجود ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اسلامی مسائل پر بحث و تمحیص کے لیے عربی زبان کا گہرا علم کیا معنیٰ، سرسری واقفیت بھی ضروری نہیں سمجھی جاتی۔

تمام نصوص کا غیر جانب داری کے ساتھ مطالعہ ہونا چاہیے

۲- جو موضوع زیر بحث ہو، انڈکس کی مدد سے، اس سے متعلق حسب منشا دو ایک جملوں کا لے لینا صحیح نہیں ہے، بلکہ اس سلسلے کے تمام نصوص کا غیر جانب داری اور اخلاص کے ساتھ مطالعہ ہونا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ ان نصوص کو کسی مزعومہ فکر و خیال کی تائید یا تردید میں استعمال کیا جائے، ان کے الفاظ، اسلوب، سیاق و سباق اور پس منظر کی روشنی میں ان کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

حدیث کی صحت کا اطمینان کرلیا جائے

۳- جس مسئلہ میں قرآن مجید کے علاوہ حدیث بھی زیر بحث ہو اس کی صحت کا اطمینان کرلیا جائے۔ اس لیے کہ اگر کسی حدیث سے آپ کچھ نتائج اخذ کرتے چلے جائیں اور ائمہ حدیث اسے حدیث ماننے ہی سے انکار کردیں تو آپ کے اخذ کردہ نتائج کی پوری عمارت ازخود منہدم ہوجائے گی۔

زیر بحث حکم کے بارے میں مکمل واقفیت ناگزیر ہے

۴- جو حکم زیر بحث ہو اس کے متعلق یہ جاننا ضروری ہے کہ آیا وہ وقتی اور عارضی ہے یا ابدی اور دائمی، عام ہے یا خاص، اس کے ساتھ کوئی شرط لگی ہوئی ہے یا وہ غیر مشروط ہے، وہ وجوب کے لیے ہے یا محض ندب و استحباب کے لیے؟ جب تک اس کی صحیح نوعیت متعین نہ ہو جائے اس کے بارے میں گفتگو کو آگے بڑھانا درست نہ ہوگا۔

دین کی پوری تعلیمات سامنے ہوں

۵- کسی بھی حکم کو ٹھیک سمجھنے کے لیے صرف ان نصوص کا مطالعہ کافی نہیں ہے جن میں براہِ راست وہ حکم آیا ہے۔ شریعت کے کسی حکم کو الگ سے دیکھنے میں بعض اوقات غلط فہمی کا امکان ہے، لیکن اسی کو اگر دین کی پوری تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ غلط فہمی دور ہوسکتی ہے۔ اسلام میں چور کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم ہے۔ ایک شخص اسے جرم کے مقابلے میں انتہائی سخت اور غیر معمولی سزا قرار دے سکتا ہے۔ لیکن جب وہ یہ دیکھے گا کہ اس حکم کو نافذ کرنے سے پہلے اسلام انسان کے اندر خدا اور آخرت کا خوف پیدا کرتا ہے، معاشرہ میں ہمدردی و غم خواری کے جذبات کو نشو و نما دیتا ہے، ریاست کو غریبوں اور ناداروں کی معاشی کفالت کی ہدایت کرتا ہے اور اس بات کی نگرانی کرتا ہے کہ کوئی شخص ایسے حالات میں نہ گھر جائے کہ وہ چوری کے ذریعے اپنا پیٹ بھرنے پر مجبور ہو جائے، تو اس کی رائے بدل سکتی ہے اور اسے وہ حق بجانب قرار دے سکتا ہے۔

عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین پر بھی نظر ہو

۶- رسولِ اکرم ﷺ نے اسلام کو محض ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں پیش کیا، بلکہ اس کی بنیاد پر ایک امت برپا کی، ایک معاشرہ قائم کیا اور ایک مملکت کا نظام چلا کر دکھایا، پھر آپ کے بعد خلفاء راشدین نے اسی نہج پر اسے جاری رکھا۔ یہ اسلام کی ایک مستند عملی تفسیر ہے۔ اسلام کا مطالعہ اس عملی تفسیر کو نظر انداز کر کے نہیں ہوسکتا۔ کسی بھی مسئلہ پر سوچتے وقت یہ

دیکھنا بالکل فطری بھی ہے اور ضروری بھی کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کے دور میں اسے کس طرح سمجھا گیا اور اس پر کس طرح عمل درآمد ہوا۔ اسلام کی ہر وہ تعبیر وتشریح، جسے یہ دور مبارک رد کردے، کبھی قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

اسلام کے مطالعے کے سلسلے میں ان بنیادی باتوں کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ ہمارا مطالعہ غلط رُخ پر ہونے لگے اور ہم اپنے خود ساختہ تصورات کو اسلام کی طرف منسوب کر بیٹھیں۔ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی قرآن و حدیث کو اپنے مزعومہ افکار و خیالات کے لیے استعمال کیا گیا اور انھیں ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی تو بڑی بھیانک غلطیاں سرزد ہوئیں، مختلف فرقے وجود میں آئے اور امت کا شیرازہ منتشر ہوکر رہ گیا۔ اسلام کی تعبیر وتشریح میں اس سے پوری طرح احتراز کرنا چاہیے۔

(سہ ماہی 'تحقیقات اسلامی' علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۸۳ء)

نظامِ شرک
اور اس کے خلاف اتمامِ حجت

ہر نظام کی کچھ فکری بنیادیں ہوتی ہیں۔ ان پر اس کا پورا تہذیبی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے۔ اس نظام کو بدلنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی فکری بنیادوں کو منہدم کر دیا جائے۔ اس کے بغیر کسی نئے نظام کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ اللہ تعالیٰ کے رسول جن قوموں میں مبعوث ہوئے شرک ان کی فکری اساس تھی۔ اس سے خاص قسم کی عبادات، تہذیب، معاشرت، رسوم و رواج، نظمِ اجتماعی اور نظامِ سیاست وجود میں آتا تھا اور پوری زندگی پر دیویوں اور دیوتاؤں کی حکومت ہوتی تھی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نظام کے علم برداروں کے پاس اس کے حق میں کوئی دلیل نہیں تھی۔ ان کے پاس عقل اور منطق تھی، دنیوی علوم اور فلسفے تھے، باپ دادا کے طور طریقے تھے، قومی روایات تھیں، مخصوص رسوم و رواج تھے۔ وہ بے وقوف اور نادان بھی نہیں تھے۔ دنیا کے معاملات میں وہ بڑے زیرک اور دانا تھے، لیکن انھیں اپنے اس رویہ میں کوئی خرابی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اللہ کے رسول دلائل و براہین اور قرآن کے الفاظ میں 'بینات' کے ذریعے ان کی ایک ایک علمی، فکری، دینی، اخلاقی اور عملی کم زوری واضح کرتے تھے اور اصلاح کا فرض انجام دیتے ہیں۔

رسولوں کے ذریعے شرک کی تردید

اللہ تعالیٰ کے رسول شرک کی اس زور سے تردید کرتے ہیں اور توحید کو اس قوت

کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ شرک کے کسی علم بردار کے پاس کوئی حجت باقی نہیں رہتی۔ وہ انسان کی عقل سے بہ راہِ راست خطاب کرتے ہیں، اس کی فطرت سے اپیل کرتے ہیں، زمین اور آسمان سے اپنے دعویٰ کے حق میں بے شمار دلائل فراہم کرتے ہیں اور تاریخ کے اوراق کھول کر اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد اسے کھلی فضا میں اور پوری آزادی کے ساتھ فیصلہ کرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کی جنگ سراسر نظریاتی ہوتی ہے اور وہ اتنی کامیابی کے ساتھ یہ جنگ لڑتے ہیں کہ مخالف نظریات قدم قدم پر شکست کھاتے چلے جاتے ہیں۔ وہ صاف صاف اور دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں:

وَ مَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهاً اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ○ (المومنون:۱۱۷)

جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے، جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے، بے شک کافر فلاح نہیں پائیں گے۔

وہ پورے زور اور قوت کے ساتھ چیلنج کرتے ہیں:

أَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ (النمل:۶۴)

کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے۔ ان سے کہو کہ وہ اپنی دلیل پیش کریں اگر وہ سچے ہیں۔

اللہ کے رسول دلائل کی پوری قوت کے ساتھ یہ ثابت کر دکھاتے ہیں کہ یہ کائنات توحید کی بنیاد پر قائم ہے اور شرک محض ظن وتخمین کی پیداوار ہے، جسے کسی دلیل کے ذریعے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ مَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ○ (یونس:۶۶)

سنو! جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب اللہ کی مملوک ہیں۔ جو لوگ اللہ کے سوا (اس کے) شریکوں کو پکار رہے ہیں وہ نرے وہم وگمان کے پیرو ہیں اور اٹکل پچو دوڑاتے ہیں۔

معقول اور مدلّل بحث

قرآن مجید نے شرک پر زبردست تنقید کی، اس کی کم زوریاں واضح کیں اور اس کے مقابلہ میں توحید خالص کا تصور پیش کیا۔ اس موضوع پر اس نے اتنی معقول اور مدلل بحث کی ہے کہ شرک کا اعتبار ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا اور عقل کے میدان میں اسے اپنا وجود ثابت کرنا ممکن نہیں رہا۔

اس طرح شرک جن بیساکھیوں پر قائم ہوتا ہے وہ سب کی سب یکے بعد دیگرے گرتی چلی جاتی ہیں اور کسی بھی دلیل یا توجیہ کے ذریعے اسے سہارا دینا مشکل رہ جاتا ہے۔ اس کے باوجود مخاطب قوم کو اگر اس کا پندارِ علم حق کو قبول کرنے نہ دے اور وہ جہالت و سرکشی سے باز نہ آئے تو اس کا یہ سراسر غیر علمی اور غیر عقلی رویہ اس کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے اور وہ خدا کے عذاب کی مستحق ہوجاتی ہے۔ یہی حقیقت قرآن مجید کے ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۝ (المومن:۸۳)

جب ان کے رسول ان کے پاس بینات لے کر آئے تو وہ اسی علم میں مگن رہے جو ان کے پاس تھا اور پھر اسی چیز کی لپیٹ میں آگئے، جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

عاد و ثمود کی قومیں اپنے زمانہ کے لحاظ سے بڑی شان دار تہذیبوں کی مالک تھیں، اس کے علم بردار اندھے بہرے اور نادان نہیں تھے، دنیا کے حالات سے باخبر تھے، بھلے برے کی تمیز کر سکتے تھے، لیکن جب انھوں نے رسولوں کی تعلیمات اور ان کے دلائل کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور حقارت سے اُٹھیں ٹھکرا دیا تو ان کی تہذیبیں خاک کا ڈھیر ہوکر رہ گئیں۔ چناں چہ قرآن نے مشرکین عرب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعاً وَّ اَبْصَاراً وَّ اَفْئِدَةً

ہم نے ان کو ان چیزوں پر اقتدار دیا تھا جن پر تمھیں اقتدار نہیں دیا۔ ہم نے انھیں کان، آنکھ

فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ○ (الاحقاف:۲۶)

اور دل سب کچھ دے رکھے تھے، لیکن ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کے دل ان کے کچھ کام نہ آئے کیوں کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور اسی چیز کی لپیٹ میں آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

حجت کس طرح پوری کی جائے؟

اللہ تعالیٰ کے رسولوں کا یہ انداز بتاتا ہے کہ قوموں پر حجت کس طرح پوری کی جاتی ہے اور موجودہ دور اسلام کے خادموں سے کس نوعیت کی فکری جدوجہد کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے ان فرستادوں نے جس طرح نظامِ شرک کو ہر پہلو سے ظن وتخمین ثابت کر دکھایا تھا، اسی طرح یہ ثابت کر دیا جائے کہ موجودہ دور کے افکار بھی وہم و گمان کی پیداوار ہیں۔ لیکن کسی جمے ہوئے فکر کو محض الفاظ کے زور سے بے بنیاد نہیں قرار دیا جاسکتا، اس کے لیے دورِ حاضر نے اپنے اردگرد علم وفن کا جو حصار کھینچ رکھا ہے، اسے توڑنا ہوگا اور جن بنیادوں پر وہ قائم ہے انھیں منہدم کرنا ہوگا۔ اسی کے بعد اسلام ایک متبادل فکر کی حیثیت سے سامنے آئے گا اور دنیا پر حجت قائم ہوسکے گی۔ اس سلسلے میں مختلف افراد اور حلقوں کی طرف سے اب تک جو علمی پیش رفت ہوئی ہے، اس کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ابھی منزل بہت دور ہے۔ ابھی اسلام دورِ جدید کا جواب نہیں بن سکا ہے۔ ہمیں فکری محاذ پر اپنی کوششوں کو اس حد تک بڑھانا ہوگا کہ اسلام دورِ جدید کا جواب بن جائے اور دنیا پر اس کی طرف سے حجت تمام ہوجائے۔

(تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء)

❀

موجودہ الحادی فکر اور اسلام

اسلام الحاد کا جواب ہے

اسلام اللہ تعالیٰ کے واحد دین کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ آج کا پورا نظامِ فکر اس کے خلاف ہے۔ یہ نظام فکر کسی ایک متعین فلسفہ پر قائم نہیں ہے، اس کے پیچھے بہت سے فلسفے کام کر رہے ہیں۔ انسانی فکر پر ان کے اثرات بھی یکساں نہیں ہیں۔ کسی کی گرفت زیادہ اور کسی کی کم ہے۔ لیکن ان سب کی بنیاد الحاد ہے اور الحاد نے اسلام کے بنیادی تصورات ہی کو بدل دیا ہے۔ خدا کی جگہ مادہ نے، وحی و رسالت کی جگہ عقل و تجربہ نے، آخرت اور وہاں کی جزا و سزا کے عقیدے کی جگہ دنیا کے مفاد نے لے لی ہے۔ یہی ملحدانہ افکار آج کی علمی دنیا کے زندہ افکار ہیں۔ ان پر غور وفکر، بحث و تحقیق اور نقد ونظر سے، ایوانِ علم کے در و بام گونج رہے ہیں۔ ان ملحدانہ افکار کے درمیان اختلافات بھی ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی تردید وتغلیط بھی کرتے ہیں اور ہر فکر دوسرے کا بدل بن کر سامنے آتا رہتا ہے۔ لیکن یہ سب الحاد کی نت نئی شکلیں ہیں اور ہر شکل دوسری کی جگہ لینے کے لیے بے تاب ہے۔ افکار ونظریات کے اس معرکہ میں اسلام فکری سطح پر غیر متعلق سا ہوکر رہ گیا ہے۔ اسے ماننے یا نہ ماننے کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے۔ ابھی تو ایک متبادل فکر کے طور پر بھی وہ کہیں زیر بحث نہیں ہے۔ قرآن مجید ایک چیلنج بن کر دنیا میں آیا۔ اس نے مخالفین سے کہا تم اور تمھارے اولیاء و سرپرست سب مل کر بھی اس جیسی کتاب نہیں پیش کرسکتے، بلکہ اس کی ایک سورت کا جواب بھی تم سے ممکن نہیں ہے۔ قرآن مجید اپنے الفاظ اور اسلوب ہی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ

اپنے فکر و فلسفہ کے لحاظ سے بھی چیلنج تھا۔ وہ آج کے ملحدانہ نظریات کے لیے بھی ایک چیلنج ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے علوم و معارف کو اس طرح کھول کر بیان کیا جائے کہ وہ اس کا جواب بن جائے۔ قرآن نے رسولِ خدا ﷺ کا ایک فرض یہ بتایا کہ وہ کتابُ اللہ کی تبیین وتشریح کریں تا کہ لوگ اپنے رویہ پر نظر ثانی کرسکیں:

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ وَ لَعَلَّهُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ۝

اور اب ہم نے یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی توضیح و تشریح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے اور تا کہ لوگ غور وفکر کریں۔ (النحل: ۴۴)

جو لوگ دنیا میں اللہ کے دین کی سربلندی چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اس کی کتاب کی اس طرح شرح وتفسیر کریں کہ وہ موجودہ دور کے ہر فکر و فلسفہ کا جواب بن جائے۔ ابھی اسلام کو ایک جوابی فکر بن کر ابھرنا باقی ہے۔ اس کے بعد اللہ نے چاہا تو اس کے غلبہ کی راہیں بھی کھلتی چلی جائیں گی۔

الحاد ہر رُخ سے اسلام کا حریف ہے

الحاد محض ایک عقلی اور نظریاتی فلسفہ نہیں ہے۔ یہ زندگی کا پورا نظام ہے جو اس تصوّر پر مبنی ہے کہ انسان اپنے مسائلِ حیات خود حل کرسکتا ہے۔ وہ کسی آسمانی ہدایت کا محتاج نہیں ہے۔ اسلام نے زندگی کا جو نظام دیا ہے اسے صرف یہی نہیں کہ وہ خدائی نظام تسلیم نہیں کرتا، بلکہ اسے تاریخ کا ایک ایسا تجربہ قرار دیتا ہے، جسے اب دوہرایا نہیں جاسکتا۔ اس کے نزدیک محمد ﷺ اپنے وقت کے سیاسی حالات کی پیداوار تھے۔ آپ کی تعلیمات ابدی اور عالم گیر نہیں ہیں، یہ وقت اور ماحول کی تابع ہیں۔ حالات چوں کہ بدل گئے ہیں اس لیے ان کی افادیت اور معنویت بھی ختم ہوگئی ہے۔ اب یہ آؤٹ آف ڈیٹ (Out of Date) اور نا قابل عمل ہیں۔ اس نظام کو اسلام کے کسی دو ایک پہلوؤں پر اعتراض نہیں ہے، بلکہ اس کا ہر پہلو اس کے اعتراضات کی زد میں ہے۔ اس کی عبادات بھی، اس کے اخلاق بھی، اس کی تہذیب بھی، اس کی معاشرت بھی، اس کا قانون اور اس کی سیاست بھی۔ اس کے سبھی پہلو اس کی تنقید کا نشانہ

بنے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اسلام کے پورے نظام کو قائم کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ اس پر جس پہلو سے بھی اعتراض ہو اس کا جواب فراہم کریں۔ آج طبیعی سائنس میں ڈارون، نفسیات میں فرائڈ، معاشیات میں مارکس اور تاریخ میں ٹائن بی جیسے ملحدین چھائے ہوئے ہیں۔ ہمارے یہاں ایسے محققین ہونے چاہئیں جو نہ صرف یہ کہ ان کی فکری خامیوں کو پکڑ سکیں، بلکہ اسلامی فکر کو ایک متبادل فکر کے طور پر پیش کر سکیں۔ اس کے بغیر آج کے یہ جمے ہوئے افکار اپنی جگہ چھوڑ نہیں سکتے۔

اسلامی تعلیمات کو مشتبہ بنانے کی کوشش

مغرب نے اسلام کی تعلیمات ہی پر اعتراضات نہیں کیے، اس کے استناد کو بھی مشتبہ بنانے کی کوشش کی اور اب بھی یہ کوشش برابر جاری ہے۔ اس نے بہت ہی معصومانہ انداز میں اور بڑی حکمت سے یہ سمجھانا شروع کیا کہ قرآن مجید اللہ کا کلام نہیں ہے، بلکہ یہ محمد ﷺ کے غیر مربوط اور غیر منطقی خیالات کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ پوری طرح محفوظ بھی نہیں ہے۔ اس میں حذف و اضافہ ہوا ہے۔ احادیث ناقابل اعتبار ہیں۔ یہ دورِ اول کے سیاسی اور مذہبی مقاصد کے لیے وضع کی گئی تھیں۔ اسلام کا قانونی ذخیرہ دوسرے قوانین سے ماخوذ ہے۔ یہ سارے مہملات ریسرچ اور تحقیق کے نام سے پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں آپ کو ثابت کرنا ہوگا:

وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ (حٰمٓ السّجدة:۴۱-۴۲)

بے شک وہ ایک زبردست کتاب ہے۔ باطل اس میں نہ تو آگے سے آ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔ یہ اس خدا کی طرف سے آئی ہے جو حکمت والا اور تعریف والا ہے۔

مغربی فکر سے مرعوبیت

موجودہ زمانے میں اسلام کے لیے ایک اور فکری چیلنج بھی ہے۔ یہ چیلنج مغربی فکر سے مرعوبیت نے پیدا کیا ہے۔ انسان کے ذہن و فکر پر وقت کے غالب افکار کی حکومت ہوتی

ہے۔ مخالف افکار ان کے سامنے سرنگوں ہوجاتے ہیں اور اپنے وجود اور بقا کے لیے اس کی سند جواز ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ مغربی افکار کا جب غلبہ ہوا تو یہ مان لیا گیا کہ وہی حق وصداقت کا معیار ہیں۔ وہی تہذیب، معاشرت، اخلاق، قانون و سیاست برحق اور معقول ہے جو ان افکار پر مبنی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے اسلام کا نام لینے والوں نے بھی اسی میں عافیت سمجھی کہ اپنے دین و مذہب کو ان افکار سے ہم آہنگ کرلیں، تاکہ ان پر قدامت پرستی اور دقیانوسیت کا الزام نہ آئے اور انھیں دین کا نام لینے پر کوئی شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ اس کے لیے اسلام کو زبردستی کھینچ کر مغربی افکار و اقدار سے قریب کیا گیا اور اس کھینچ تان میں اس بات کی بھی پروا نہ کی گئی کہ اسلام کی تعلیمات بری طرح مجروح ہو رہی ہیں۔ اسلام کی جو ہدایات مغرب کے سانچے میں کسی طرح فٹ نہیں ہوتی تھیں انھیں بھی تراش خراش کر کے اس سانچے میں بٹھایا گیا۔ اس کے لیے قرآن کے الفاظ تو نہیں بدلے گئے، البتہ ان کے معانی اور مقاصد بدل دیے گئے۔ یہ معنوی تحریف اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی اور آج بھی ہو رہی ہے کہ جو لوگ دین کو اس کی صحیح شکل میں قائم کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے اسے نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ یہ اس کارِ تجدید کا ایک حصہ ہے، جس کی فضیلت حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے:

یحمل ھٰذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تحریف الغالین و انتحال المبطلین و تاویل الجاھلین

(مشکوٰۃ، کتاب العلم بحوالہ بیہقی)

ہر نسل کے بعد آنے والی نسل میں ایسے سچے اور عادل انسان اس علم کے حامل ہوں گے جو دین میں غلو کرنے والوں کی تحریف، باطل پرستوں کے جھوٹے استدلال اور جاہلوں کی تاویل کو ختم کریں گے۔

مذہب کی طرف رجحان

اس بحث کا تعلق مغرب کے افکار سے ہے۔ ان افکار کی اہمیت یہ ہے کہ یہ آج کے بااقتدار اور تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، عوام پر اس کی گرفت پہلے بھی کافی مضبوط تھی، اب بھی مضبوط ہے۔ جدید ذہن اس سے بہت دور ہوچکا تھا، لیکن اب آہستہ آہستہ اس کی توجہ مذہب کی طرف ہو رہی ہے۔ اس کی

ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دور کی بڑھتی ہوئی مادہ پرستی نے اسے روحانی سکون اور چین سے محروم کر دیا ہے۔ اس کا تن آسودہ ہے، لیکن روح پیاسی ہے۔ مذہب جب اس کے سامنے اس حیثیت سے آتا ہے کہ وہ اسے روحانی سکون فراہم کرسکتا ہے تو وہ اس کے اندر ایک طرح کی کشش محسوس کرتا ہے۔ لیکن یہ موجودہ دور کی مادیت کے خلاف ایک وقتی ردعمل ہے، جو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ انسان نہ تو محض مادہ ہے اور نہ صرف روح، بلکہ دونوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی فطرت دونوں کی تسکین چاہتی ہے۔ ایک بڑا علمی اور فکری کام یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلام مادہ اور روح کے تقاضوں کو ایک ساتھ پورا کرتا ہے اور مادیت اور روحانیت کے درمیان اعتدال کی راہ دکھاتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ آدمی روحانیت کے نام پر مادی دنیا کو چھوڑ بیٹھے، بلکہ وہ یہ ہدایت کرتا ہے کہ آدمی اس مادی دنیا میں گم ہوکر خدا کو نہ بھول جائے۔ حلال و حرام کی تمیز کے بغیر جانوروں کی سی زندگی نہ گزارے، بلکہ ان حدود کا پابند رہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کردیے ہیں اور اس کا شکر گزار بندہ ہوکر دنیا میں زندگی گزارے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَاشْکُرُوْا لِلّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ○	اے ایمان والو! ہم نے جو پاک (حلال) چیزیں دی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ (پیو) اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم (حقیقت میں) اسی کی عبادت کرتے ہو۔
(البقرۃ: ۱۷۲)	

اسلام دنیا اور آخرت اور مادیت و روحانیت کا حسین امتزاج ہے۔ اسے علمی طور پر بہتر سے بہتر طریقہ سے ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔

(سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اکتوبر-دسمبر ۱۹۸۵ء)

شریعت کی ابدیت

کیا شریعت ایک خاص دور کے لیے تھی؟

بعض لوگوں کا خیال ہے اور اس خیال کو مختلف حلقوں سے اسلوب بدل بدل کر پیش کیا جاتا رہتا ہے کہ شریعت ایک خاص وقت اور ماحول میں نازل ہوئی تھی۔ اب وہ دور اور حالات باقی نہیں رہے اور ہمیں ایک نئی صورتِ حال کا سامنا ہے، اس لیے شریعت کو جوں کا توں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس میں مناسب اصلاح اور ترمیم نہیں کی گئی تو وہ دورِ جدید کی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکے گی اور امت کے لیے موجودہ پستی سے نکلنا ممکن نہ ہوگا۔ بعض لوگ یہ بات کھل کر تو نہیں کہتے، لیکن اپنی اس خواہش میں مضطرب اور بے چین ضرور نظر آتے ہیں کہ شریعت کو کسی نہ کسی طرح دورِ جدید سے ہم آہنگ کر کے دکھائیں، تاکہ شریعت کا نام لینے والوں کو یا کم از کم خود ان کو اس کی ناموزونیت سے پشیمانی نہ اٹھانی پڑے۔ اس کے لیے انہیں شریعت کی ایسی تعبیر وتفسیر کرنے میں بھی تامل نہیں ہوتا جو زبان و بیان، اس کی مستند تشریحات اور امت کے تعامل سے کسی طرح میل نہیں کھاتی۔

شریعت میں ترمیم کے مطالبات

ان خیالات کا تعلق شریعت کے کسی خاص مسئلہ سے نہیں، بلکہ خدا کی شریعت جتنی وسیع و ہمہ گیر ہے، ان کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع و ہمہ گیر ہے۔ کسی کو اس کے نظامِ عبادت میں نقص نظر آتا ہے، کوئی اس کی معاشرت کو بدلنا چاہتا ہے، کسی کو اس کی تہذیب و ثقافت میں

رفو گری کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، کوئی اس کی معاشی تعلیمات میں پیوند کاری کا مشورہ دیتا ہے، کوئی اس کے حدود و تعزیرات کی وحشت و بربریت دور کرنا چاہتا ہے۔ اگر ان سب خیالات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کر دیا جائے تو اس کی ایسی بھیانک تصویر بنے گی کہ اس کی طرف شوق و رغبت سے بڑھنے کی جگہ آدمی اس سے دور بھاگے گا، بلکہ بعید نہیں کہ وہ اس شک و شبہ میں بھی گرفتار ہو جائے کہ یہ شریعت خدائے رب العزت کی طرف سے آئی بھی ہے یا نہیں؟

ان خیالات کا اظہار اسلام کے کسی منکر یا مخالف کی طرف سے ہو تو اسے شریعت کی معنویت سمجھائی جاسکتی ہے اور وقت ضرورت کسی نہ کسی درجہ میں اس کی کوشش ہوتی بھی رہتی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس قسم کے خیالات بعض اوقات ان لوگوں کی طرف سے سامنے آتے ہیں جو خود کو اسلام کے ماننے والے اور اس کے ہمدرد و بہی خواہ کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، حالاں کہ جس شخص کو یقین ہو کہ شریعت کسی انسان کی تصنیف کردہ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہے اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسی کی طرف سے اس کی تشریح و توضیح کی ہے، وہ کبھی ان خیالات کا اظہار نہیں کرسکتا۔ یہاں ہم یہی دیکھنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کو کس حیثیت سے پیش کیا ہے؟

شریعت ہر پہلو سے مکمل ہے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً تین ماہ قبل حجۃ الوداع کے موقعے پر اللہ تعالیٰ نے صاف وصریح الفاظ میں اعلان فرمایا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۝

آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر میں نے پسند کرلیا۔ (البقرۃ: ۱۷۲)

آیت میں 'دین' کا لفظ آیا ہے جس میں شریعت بھی داخل ہے، بلکہ بعض احکام شریعت کے سیاق وسباق ہی میں یہ آیت آئی ہے۔ اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ

شریعت ہر پہلو سے مکمل ہوچکی ہے۔ اب نہ تو کوئی نئی شریعت آئے گی اور نہ اس میں قیامت تک کسی قسم کا حذف و اضافہ اور ترمیم و تنسیخ ہوگی۔ یہ ختم نبوت کی بھی دلیل ہے۔ اس لیے کہ شریعت میں چھوٹی یا بڑی کوئی بھی تبدیلی پیغمبروں ہی کے ذریعے واقع ہوتی ہے۔ جب ایک ابدی شریعت آ گئی تو کسی نئے پیغمبر کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی۔ اب شریعت میں کسی حذف و اضافہ کا مطلب صرف یہ نہ ہوگا کہ محمد ﷺ کے دعویِ ختم نبوت کو نہ مانا جائے، بلکہ یہ خود کو مقام نبوت تک پہنچانے کے مترادف بھی ہوگا۔

اس آیت کی حافظ ابن کثیرؒ نے بڑی عمدہ اور پر معنی تشریح کی ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ ہم اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو جن نعمتوں سے نوازا ہے ان میں سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے اس کے لیے اپنے دین کو اس طرح مکمل کر دیا کہ اب اسے کسی دین کی اور اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے سوا کسی پیغمبر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاتم الانبیاء بنایا اور (سارے ہی) جنوں اور انسانوں کی طرف مبعوث فرمایا۔ لہٰذا حلال صرف وہ ہے جسے آپ نے حلال ٹھہرایا اور حرام صرف وہ ہے جسے آپ نے حرام کہا۔ دین بس وہ ہے جو آپ نے بتایا، جس بات کی بھی آپ نے خبر دی وہ حق ہے اور سچی ہے۔ اس میں نہ جھوٹ ہے اور نہ اس کے واقع ہونے میں کوئی شبہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو مکمل کردیا تو گویا اس امت پر اپنی نعمت بھی مکمل کردی۔ لہٰذا اسے اس نعمت پر خوش اور مطمئن ہونا چاہیے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: آیت میں دین سے مراد اسلام ہے۔ اللہ نے اپنے نبی اور مومنوں کو اس میں بتایا ہے کہ اس نے ان کے ایمان کو مکمل کر دیا۔ اب اس میں انھیں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس نے اسے مکمل کردیا، اب اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کرے گا اور اسے اس نے پسند کرلیا، اب اس سے کبھی ناخوش نہ ہوگا۔ (تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۱۲)

حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات پر یقین ہو وہ دین میں کسی حذف و اضافہ اور نقص کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ تکمیلِ دین اور ختمِ نبوت نے اس کے نزدیک اس امکان ہی کو قیامت تک کے لیے ختم کر دیا ہے۔

یہ تو ایک اصولی بات ہوئی۔ اس پر بعض اور پہلوؤں سے بھی غور ہوسکتا ہے۔

تحلیل وتحریم کا حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے

شریعت کا ایک اہم مقصد اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام اور حلال کی تعیین بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے وہ ساری چیزیں حلال کردی ہیں جو طیب اور پاک ہیں، جن کو اس کی فطرتِ سلیمہ پسند کرتی ہے، جو اس کی جسمانی صحت اور اخلاق و روحانیت کے لیے مفید ہیں۔ اسی طرح اس نے ان تمام چیزوں کو حرام ٹھہرا دیا ہے، جن کو قبول کرنے سے انسان کی فطرت انکار کرتی ہے، جو اس کی صحت اور کردار پر برا اثر ڈالتی ہیں اور جو خبیث اور ناپاک ہیں۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ کا ایک وصف اس نے یہ بیان فرمایا کہ ''وہ تمام پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں۔'' (الاعراف:۱۵۷)

رہبانیت نے پاک چیزوں کو بھی حرام قرار دے رکھا ہے۔ اسلام نے اسے غیر الٰہی طریقہ بتایا اور کہا ''کھاؤ اور پیو، لیکن اسراف نہ کرو، بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے پوچھو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے جو زیب و زینت نکالی ہے اور کھانے کی صاف ستھری چیزیں پیدا کی ہیں انھیں کس نے حرام کیا؟ ان سے کہو اس دنیا کی زندگی میں یہ اصلاً ایمان والوں ہی کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو خالص ان ہی کے واسطے ہوں گی۔'' (الاعراف:۳۱،۳۲)اس نے یہ بھی کہا کہ ''جو چیزیں اللہ نے تم پر حرام کی ہیں اس نے تفصیل سے وہ تمھیں بتادی ہیں۔'' (الانعام:۱۱۹)

اس کے ساتھ اس کے نزدیک یہ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ وہ کسی چیز کی حلت یا حرمت کا فیصلہ کرے۔ کسی دوسرے کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے۔ اس نے صاف کہا ''تمھاری زبانیں جو جھوٹ بولتی ہیں ان کی بنا پر یہ مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ اس طرح تم اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ گے۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ چند روزہ سامانِ زیست ہے اور اس کے بعد ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔'' (النحل:۱۱۶،۱۱۷)

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔ ''اس حکم میں ہر وہ شخص داخل ہے، جس نے بغیر کسی

سندِ شرعی کے نئی بات پیدا کی، یا محض اپنی رائے اور خواہش کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حلال کیا اسے حرام قرار دیا اور جسے اس نے حرام ٹھہرایا اسے حلال کر دیا۔'' (تفسیر ابن کثیر: ۲/۵۹۰)

جب کوئی شخص حلت و حرمت کا فیصلہ کرنے کا مجاز ہی نہیں ہے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی چیز کے حرام یا حلال ہونے کا فیصلہ کرے اور اس نے اس کی تفصیل بھی کردی ہے تو پھر شریعت میں حذف و اضافہ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ (یہاں اس اجتہاد سے بحث نہیں ہے جو شریعت کے حلال و حرام کی روشنی میں ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ اس کے تابع ہوتا ہے)۔

شریعت میں تبدیلی حدوداللہ کی پامالی ہے

ایک اور پہلو سے اس مسئلہ پر سوچیے۔ احکامِ شریعت کو قرآن مجید نے مختلف مقامات پر 'حدود اللہ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ روزے کے احکام کے ذیل میں فرمایا: ''یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان کے قریب نہ جاؤ۔'' (البقرۃ:۱۸۷) طلاق کے احکام بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ اللہ کے قائم کردہ حدود ہیں، جنھیں وہ جاننے والوں کے لیے بیان کرتا ہے۔'' (البقرۃ:۲۳۰) طلاق ہی کے احکام کے ذیل میں ایک اور جگہ فرمایا: ''یہ اللہ کے قائم کردہ حدود ہیں، جو ان حدود سے تجاوز کرتا ہے وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔'' (الطلاق:۱) ان حدود کی پابندی پر جنت کی خوش خبری اور ان کی خلاف ورزی پر جہنم کی وعید سنائی۔ چناں چہ میراث اور وصیت کے احکام کے سلسلے میں فرمایا: ''یہ اللہ کے قائم کردہ حدود ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اسے وہ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور جو اس کے قائم کردہ حدود سے تجاوز کرے گا اسے وہ جہنم کی آگ میں داخل کرے گا، جن میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔'' (النساء:۱۳، ۱۴)

زندگی کے مختلف معاملات میں اللہ تعالیٰ نے جو حدود قائم کیے ہیں، جن کی پابندی کی اس نے اتنی تاکید کی ہے اور جس سے تجاوز اور خلاف ورزی کو اس نے اتنی شدت سے منع کیا ہے، کیا کوئی مسلمان ان سے قدم باہر رکھنے کی کبھی ہمت کرسکتا ہے اور اگر غفلت میں کبھی ان

حدود کو توڑ دے تو اسے جائز قرار دے سکتا ہے، یا کسی کو ان کے توڑنے کا مشورہ دے سکتا ہے؟

عرب کے مشرکوں کے بارے میں قرآن نے کہا: ''جب انھیں ہماری صاف صاف آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اس کو بدل ڈالو۔'' جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دین اور شریعت میں تبدیلی چاہتے ہیں غالباً ان کی ذہنیت بھی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ قرآن نے عرب کے مشرکین کے اس مطالبہ کے جواب میں کہا کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں تبدیلی اس کا پیغمبر بھی نہیں کرسکتا: ''ان سے کہہ دو کہ میرا یہ کام نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو بس اس وحی کی اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔'' (یونس:۱۵)

کیا اس جواب کے بعد کبھی کسی صاحبِ ایمان کی طرف سے شریعت میں تبدیلی کا سوال اٹھایا جاسکتا ہے؟

(سہ ماہی 'تحقیقاتِ اسلامی' علی گڑھ۔ جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء)

಄಄

احکامِ شریعت میں حکمت کا صحیح تصور

احکامِ شریعت کے بارے میں ایک نقطۂ نظر یہ ہوسکتا ہے کہ ان کا کوئی فلسفہ اور حکمت نہیں ہے، اس لیے ان کے اندر کسی معنویت اور مقصدیت کا تلاش کرنا بے سود ہے۔ ان کی نوعیت بالکل اسی طرح کی ہے جیسے کوئی بادشاہِ وقت اپنی رعایا میں سے کسی کو کوئی بھاری پتھر یا بوجھ سر پر لاد کر دوڑنے کے لیے کہے یا کسی درخت کو چھونے کا حکم دے، مقصود صرف اس کا امتحان ہو۔ اگر وہ اس کی بات مان لے تو اسے انعام و اکرام سے نوازے اور نافرمانی کرے تو سزا دے۔ اس حکم کی تعمیل سے یہ تو ضرور ثابت ہوجائے گا کہ رعیت کا فلاں فرد اطاعت گزار ہے، اس کی عدم تعمیل سے اس کا نافرمان ہونا بھی ظاہر ہوجائے گا اور وہ بادشاہ کے انعام یا عقوبت کا مستحق بھی قرار پائے گا، لیکن اس امتحان سے اس کی روحانی، اخلاقی، سیاسی اور سماجی حالت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ امتحان سے پہلے اس کی جو کیفیت ہوگی امتحان کے بعد بھی اس کی وہی کیفیت رہے گی۔

شریعتِ الٰہی کے بارے میں ایک ظنِّ فاسد

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس نقطۂ نظر کو اللہ تعالیٰ کی شریعت کے بارے میں ایک 'ظن فاسد' قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کتاب و سنت سے اس کی تردید ہوتی ہے اور خیرالقرون کا اجماع اس کے خلاف ہے۔ یہ نقطۂ نظر کسی ایسے ہی شخص کا ہوسکتا ہے جسے علم دین سے کوئی مس نہ ہو۔ اس بے چارہ کو تو اپنی جہالت اور بے خبری پر آنسو بہانے چاہئیں۔ اس کا یہ خیال اس قابل نہیں ہے کہ اس کا کسی حیثیت سے ذکر تک کیا جائے۔ (حجۃ اللہ بالغہ۔ مقدمہ)

یہ ایک حقیقت ہے جس کا شاہ صاحبؒ نے اظہار فرمایا ہے۔ شریعت کا نزول ہوا ہی اس لیے ہے کہ انسان دین اور دنیا کی سعادت سے ہم کنار ہو۔ اس سے جس طرح تعلق باللہ پیدا ہوتا ہے اور عبادات کے طریقے اور اصول و آداب معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح دنیوی معاملات اور اجتماعی مسائل بھی حل ہوتے ہیں۔ اس میں قدم قدم پر اس بات کی رعایت کی گئی ہے کہ زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد بہترین ذرائع سے حاصل ہوں اور کسی بھی مرحلہ میں انھیں کوئی صدمہ نہ پہنچے۔ شریعت، دفعِ ضرر اور جلبِ منفعت کا وہ صاف ستھرا اور پاکیزہ نسخہ ہے جو خدائے رحیم و کریم نے انسانوں کو عطا کیا ہے۔ اس میں ان کے مختلف حالات اور ضروریات کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ اس کا ہر حکم اپنے اندر زبردست حکمت لیے ہوئے ہے۔ ان دونوں کے درمیان اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہے کہ یہ حکمت کسی اور طریقہ سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ جب تک انسان احکامِ شریعت کی غرض و غایت کو نہ جانے اور ان کی حکمت اور فلسفہ کو نہ سمجھے وہ نہ تو ان کی قدر و قیمت سے واقف ہوسکتا ہے اور نہ مختلف حالات و ظروف میں ان کا ٹھیک ٹھیک انطباق کرسکتا ہے۔ وہ اجتہادی روح، جس سے ہر موقع و محل اور ہر زمان و مکان میں شریعت کی مرضی معلوم کی جاسکے، اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ انسان اس کے فلسفہ کو سمجھتا ہو اور اس کی باریکیوں پر اس کی نظر ہو۔

احکام شریعت پر عمل اس کی حکمتیں جاننے پر موقوف نہیں ہے

شریعت کی حکمت اور فلسفہ کا یہ ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بعض لوگ اسے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ کسی بھی حکم شریعت کو اسی وقت قبول کریں گے، جب کہ اس کی حکمت اور مصلحت انھیں معلوم ہوجائے۔ شریعت کے بہت سے احکام کو انھیں محض اس بنیاد پر رد کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ ان کی معنویت خاص طور پر اس دور میں، ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

سوال یہ ہے کہ جو لوگ احکام شریعت کی حکمتوں کو اتنی اہمیت دیتے ہیں، کیا وہ ہر اس حکم کو ماننے کے لیے تیار ہیں، جس کی حکمت اور مصلحت بیان کردی جائے؟ اسلامی مفکرین

اور علوم شریعت کے ماہرین نے، وہ کون سا حکم ہے جس کی حکمت نہ بیان کی ہو۔ اس سے قطع نظر خود قرآن و حدیث میں بہت سے احکام کی حکمت بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ فرد اور معاشرہ کے لیے ان کی کیا افادیت ہے اور ان پر عمل کیوں ضروری ہے؟ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔ کہا گیا: نماز بے حیائیوں اور منکرات سے روکتی ہے (العنکبوت:۴۵) روزہ سے تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہوتا ہے (البقرہ:۱۸۳)۔ زکوٰۃ اور صدقات سے نفس کا تزکیہ اور تطہیر ہوتی ہے (التوبہ:۱۰۳)۔ زکوٰۃ کو دین وملت کے ان متعین کاموں میں صرف ہونا چاہیے، جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے (التوبہ:۶۰)۔ کعبہ میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں اور وہ حضرت ابراہیمؑ کا مقامِ عبادت ہے، اس لیے یہ اللہ کا ایک حق ہے کہ جو لوگ صاحب حیثیت ہیں وہ اس کی زیارت کریں (آل عمران:۹۷)۔ یہ تو بہت موٹی مثالیں ہیں۔ اسی طرح شریعت نے دوسرے احکام کی بھی حکمتیں بیان کی ہیں۔ ان حکمتوں کا تعلق براہِ راست انسان کی دینی، اخلاقی، روحانی اور سماجی و معاشرتی زندگی سے ہے۔ اسلام کا اصرار ہے کہ ان احکام کی پابندی ہی سے سیرت و کردار کی تعمیر ہوتی اور ایک صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ جو لوگ احکام شریعت کی حکمت جاننا چاہتے ہیں اور اس کے بغیر انھیں قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں، کیا وہ اس کی بیان کردہ ان حکمتوں سے مطمئن ہیں؟ کیا وہ ان احکام کو خوش دلی سے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں؟ حالاں کہ ان میں وہ لوگ بھی ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ دن میں پانچ وقت کی نماز اور رمضان میں تیس دن کے روزے انسان کی قوتِ کار کو متاثر کرتے ہیں اور ان کی پابندی کرتے ہوئے انسان زندگی کی جدوجہد میں اپنا صحیح کردار ادا نہیں کرسکتا، جو سرکاری ٹیکس کو زکوٰۃ کا بدل قرار دیتے ہیں اور جن کے نزدیک حج اور قربانی وقت اور پیسہ کا ضیاع ہے۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی بیان کردہ حکمتیں بھی مطمئن نہ کرسکیں، پھر کس انسان کے بس میں ہے کہ انھیں مطمئن کردے؟

شریعت کی حکمتوں کے بارے میں دو موقف

شریعت کو من جانب اللہ مان کر اس کی حکمتوں کو معلوم کرنا، اس کے اغراض و

مقاصد کو سمجھنا اور مختلف احوال وظروف میں ان کے انطباق کی کوشش کرنا ایک الگ بات ہے اور جب تک کسی حکم کی مصلحت سمجھ میں نہ آئے اسے نہ ماننا ایک دوسری ہی چیز ہے۔ پہلی صورت باعثِ اجر وثواب ہے اور دوسری صورت کے جواز کا تصور بھی ایک مسلمان نہیں کرسکتا۔ مسلمان کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ہر حکم کو بے چوں و چرا تسلیم کرے۔ وہ کسی حکم کا اس وجہ سے انکار نہیں کرسکتا کہ اس کی حکمت اور مصلحت اس کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ وہ خدا کی شریعت کو ہر نقص سے پاک اور حکمتوں سے معمور تصور کرے گا اور کسی حکم کی حکمت اس کی سمجھ سے باہر ہو تو شریعت پر الزام لگانے کی جگہ اسے اپنی عقل کا قصور سمجھے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کے لیے شریعت زنجیرِ پا بن چکی ہے اور جو اسے بہر طور توڑ پھینکنا چاہتے ہیں، انھیں اس کے احکام میں کوئی حکمت اور معنویت ہی نظر نہیں آتی۔ وہ شریعت سے دامن چھڑانا چاہتے ہیں، لیکن اس طرح کہ اس کا کوئی الزام ان پر نہ آئے۔ اس کے لیے وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ شریعت کی بندشیں انھوں نے توڑ دی ہیں تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے، شریعت ہی کا قصور ہے۔ اس کی یہ بندشیں ہی سراسر بے معنی ہیں۔ ان کا نہ ہونا ان کے ہونے سے بہتر ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر وہ خدا اور اس کی شریعت کو مجرم ٹھہرانے کی جگہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرلیتے؟

(سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اکتوبر–دسمبر ۱۹۸۲ء)

ಌಐ

احیائے اسلام کے علمی تقاضے

(بعض قرآنی اصطلاحات کی روشنی میں)

گزشتہ پچاس برس میں مسلمان بڑے نازک دور سے گزرتے رہے ہیں۔ مغربی افکار کے غلبہ اور اسلام سے بے خبری نے ان کے افکار کی دنیا بدل دی، سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ بدل دیا، نیک و بد کی قدریں بدل دیں، جو خوب تھا وہ ناخوب ہوگیا اور جو ناخوب تھا اسے خوب سمجھ لیا گیا۔ عالم اسلام سے مغرب کا سیاسی اقتدار تو آہستہ آہستہ ختم ہوتا چلا گیا لیکن اس کی جگہ کوئی دوسرا مضبوط سیاسی نظام نہ ابھر سکا، جس کی وجہ سے ہر طرف انتشار اور افتراق برپا رہا۔ دنیا کی اس سب سے بڑی امت کی قوتیں آپس کے نزاعات اور باہمی کشمکش میں ضائع ہوتی رہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے غیر اہم مسائل میں الجھ کر رہ گئی اور کوئی ایسا قابل ذکر فکری اور عملی کارنامہ انجام نہ دے سکی، جس سے اس کی اہمیت محسوس کی جاتی۔ اقوام عالم میں اس کی افادیت مشکوک اور اس کا وزن گھٹ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اسی دوران میں پوری امت کے اندر اقامت دین اور احیائے اسلام کا احساس شدت سے ابھرا۔ یہ بات جسے زبان پر لانے میں بھی تامل ہوتا تھا پوری قوت کے ساتھ کہی جانے لگی کہ انسان ایک کل ہے، اسے مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا، ورنہ اس کی زندگی میں تضاد اور تناقض پیدا ہوجائے گا۔ اسلام اس کل پر اپنی حکم رانی چاہتا ہے۔ لہٰذا زندگی کے کسی ایک شعبہ کو نہیں بلکہ اس کے

تمام شعبوں کو اس کے تابع ہونا چاہیے۔ وہی عبادات کے طور طریقے بتائے گا، اسی سے اخلاقی ہدایات حاصل کی جائیں گی، معاشرت اور معیشت کے اصول اخذ کیے جائیں گے اور اسی کی ہدایت کے تابع حکومت و سیاست ہوگی۔ وہ غالب ہونے کے لیے ہے، اسے دنیا کے ہر فکر پر اور ہر گوشۂ حیات پر غالب ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں جو بیش قیمت لٹریچر وجود میں آیا اس میں جہاں زندگی کے اور مسائل سے بحث کی گئی ہے وہیں ان اصطلاحات کی بڑی نفیس اور جان دار تشریح بھی ہوئی ہے، جن میں اقامتِ دین اور احیائے اسلام کو امت کا نصب العین بتایا گیا ہے۔ یہ تشریح زیادہ تر دعوتی مقاصد کے تحت کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی ضرورت پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے۔ اس سے اسلام کے لیے جدوجہد کا جذبہ ابھرتا ہے اور اسے قائم و غالب کرنے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے، لیکن اس پر دعوتی پہلو اتنا چھایا ہوا ہے کہ اس کے علمی تقاضے پوری طرح نمایاں ہوکر سامنے نہیں آتے۔ احیائے اسلام اور اقامت دین ایک بڑا نازک اور پیچیدہ کام ہے۔ موجودہ دور میں اس کی نزاکت اور پیچیدگی، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ اس کے علمی تقاضے بڑے سخت ہیں۔ اس موضوع پر قرآن و حدیث کا مطالعہ مختلف پہلوؤں سے ہوسکتا ہے۔ یہاں اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ احیائے دین، اقامت دین اور غلبہ دین کے لیے قرآن مجید میں جو اصطلاحات آئی ہیں ان میں سے بعض اصطلاحات کی مدد سے اس کے علمی تقاضوں کو واضح کیا جائے۔[1]

دعوت الی اللہ

سب سے پہلے دعوت و تبلیغ کو لیجیے۔ یہ اقامت دین کا پہلا اور بنیادی مرحلہ ہے۔ دعوت یہ نہیں ہے کہ آدمی کسی بے دلیل دعویٰ پر اصرار شروع کردے۔ اگر مخاطب مان لے تو اسے اس کی خوش بختی اور اپنی سرخ روئی تصور کرنے لگے، بے چارہ نہ مانے تو اپنی ناکامی اور نااہلیت کو چھپانے کے لیے اسے اس کی ضد اور ہٹ دھرمی قرار دے

---

[1] ان اصطلاحات میں سے دعوت الی اللہ، شہادت علی الناس اور اظہارِ دین پر مزید تفصیل کے لیے راقم کی کتاب 'تجلیات قرآن' دیکھی جاسکتی ہے۔

بیٹھے، بلکہ دعوت دنیا کو ظلمتوں سے نور کی طرف لے جانے کا نام ہے۔ اس کے لیے بڑی علمی بصیرت کی ضرورت ہے۔ جس طرح بصارت سے محسوسات کی دنیا روشن ہوتی ہے، اسی طرح بصیرت سے افکار و خیالات کی دنیا بے نقاب ہوکر سامنے آتی ہے اور آدمی اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ حق و باطل کے درمیان فرق و امتیاز کرے اور استدلال کی پوری قوت کے ساتھ باطل کو رد کرکے حق کو ثابت کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اسی بصیرت کے ساتھ دعوت کا فرض انجام دیتے ہیں۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۝ (یوسف:۱۰۸)

کہہ دو: یہ میرا راستہ ہے، میں پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں خود بھی اور میری اتباع کرنے والے بھی۔ پاک ہے اللہ کی ذات (شرک سے) اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مخلص ساتھی پوری بصیرت کے ساتھ دعوت الیٰ اللہ کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی گواہی ہے کہ جو نورِ بصیرت اس کام کے لیے رسول اللہ ﷺ کو ملا تھا اس سے وہ مبارک جماعت بھی بہرہ یاب تھی، جو اس کام میں آپ کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ صحیح بات یہی ہے کہ بغیر بصیرت کے یہ فرض کوئی گروہ انجام دے بھی نہیں سکتا۔

اس آیت کی تشریح میں علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

''اے محمدؐ اعلان کر دیجیے کہ اللہ کی طرف آپ کی دعوت بصیرت، یقین اور دلیل و برہان کے ساتھ ہے اور آپ کی پیروی کرنے والے بھی بصیرت، یقین اور برہانِ عقلی و شرعی کے ساتھ یہی دعوت دے رہے ہیں۔''[۱]

قدماء میں سے ایک اور بڑے محقق حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

''اللہ کی طرف دعوت دینا بندے کے لیے سب سے اونچا اور بلند

---

[۱] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۴/ ۴۳۰

مقام ہے۔ یہ مقام آدمی کو اس دین کے علم سے حاصل ہوسکتا ہے، جس کی وہ دعوت دے رہا ہے، بلکہ دعوت میں کمال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ ممکنہ حد تک اس علم میں کمال پیدا کیا جائے۔ علم کے شرف اور عظمت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ صاحب علم ہی کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف بلائے۔"[1]

دعوت کس طرح دی جائے اور اس کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں قرآن مجید نے جہاں اس کی وضاحت کی ہے وہاں سب سے پہلے حکمت کا ذکر کیا ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ ؂ (النحل:۱۲۵)

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ دعوت دو۔

یہاں حکمت کے معنیٰ یہ بیان کیے گئے ہیں کہ مضبوط دلائل کے ساتھ دین کو واضح کیا جائے۔ چناں چہ زمخشریؒ کہتے ہیں۔

...بالحکمۃ بالمقابلۃ المحکمۃ الصحیحۃ وھی الدلیل الموضح للحق المزیل للشبھۃ[2]

دعوت و حکمت سے، یعنی ایسے بیان سے جو محکم اور صحیح ہو۔ اس سے ایسی دلیل مراد ہے، جو حق کو واضح اور (مخالف کے) شک و شبہ کو دور کردے۔

حکمت کی یہی تشریح قاضی بیضاویؒ نے بھی کی ہے۔[3]

اس طرح دین کو پوری طرح دلائل سے واضح کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے پیغمبر یہ اعلان کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ:

قَدْ جَآءَکُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِہٖ وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَیْھَا ط وَ مَآ اَنَا عَلَیْکُمْ بِحَفِیْظٍ ؂ (الانعام:۱۰۴)

تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے دلائلِ بصیرت آچکے۔ اب جو آنکھیں کھول کر دیکھے تو اس میں اسی کا فائدہ ہے اور جو آنکھیں بند کرلے تو اس کا نقصان بھی اسی کو پہنچے گا۔ میں تم پر نگراں بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں۔

۱۔ التفسیر القیم، ترتیب مولانا محمد اویس ندویؒ، ص ۳۱۹

۲۔ زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۲/ ۶۱۹

۳۔ بیضاوی: ۱/ ۵۶۱

آیت میں 'بصائر' کا لفظ آیا ہے، جو بصیرت کی جمع ہے۔ پیغمبر جو دلائل پیش کرتے ہیں انھیں بصائر سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ اس سے مخاطب کی آنکھیں کھلتی ہیں، وہ حق و باطل کو بالکل الگ الگ دیکھنے لگتا ہے، وہ دن کی روشنی میں فیصلہ کر سکتا ہے کہ اسے کدھر جانا ہے اور کس انجام سے دوچار ہونا ہے؟

انذار و تبشیر

اب ایک اور اصطلاح انذار و تبشیر کو لیجیے۔ قرآن مجید میں بار بار رسول اللہ ﷺ کو بشیر و نذیر کہا گیا ہے:

اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا ۝ (البقرۃ:۱۱۹)

ہم نے آپ کو دین حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

'انذار' کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس کی غلط روش کے برے انجام سے آگاہ کیا جائے۔ اس کی صحیح روش پر اچھے انجام کی خوش خبری دینا 'تبشیر' ہے۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی انذار و تبشیر کو بے دلیل وعظ و نصیحت اور خالی خولی ترغیب و ترہیب کے ہم معنیٰ سمجھتے ہیں۔ حالاں یہ سادہ اور سہل کام نہیں ہے۔ یہ حق کو ثابت کرنا اور باطل کو رد کرنا ہے۔ جب کسی قوم کے درمیان انذار و تبشیر کا فرض ادا کیا جاتا ہے تو حق و باطل کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے، دونوں طرف کے دلائل زیر بحث آجاتے ہیں اور مخالفین دلائل کے میدان میں شکست کھا کر مذاق اڑانے اور تمسخر کرنے لگتے ہیں۔ یہ سب انذار و تبشیر کے مراحل یا یوں سمجھئے کہ تقاضے ہیں۔ اسی بات کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَمَا نُرۡسِلُ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ وَ یُجَادِلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِالۡبَاطِلِ لِیُدۡحِضُوۡا بِہِ الۡحَقَّ وَ اتَّخَذُوۡۤا اٰیٰتِیۡ وَمَاۤ اُنۡذِرُوۡا ہُزُوًا ۝ (الکہف:۵۶)

ہم تو رسولوں کو صرف اس لیے بھیجتے ہیں کہ وہ بشارت دیں اور ڈرائیں۔ جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ باطل کی مدد سے کٹ حجتیاں کرتے ہیں، تاکہ اس کے ذریعہ حق کو پسپا کردیں۔ انھوں نے میری آیات کو اور جس عذاب سے انھیں ڈرایا گیا ہے اسے مذاق بنالیا ہے۔

اس انذار وتبشیر کے ذریعے اللہ کے رسول مخالفین پر اس طرح حجت تمام کردیتے ہیں کہ وہ دلائل کے میدان میں نہتے اور خالی ہاتھ ہوجاتے ہیں اور باطل پر جمے رہنے کے لیے ان کے پاس کوئی بنیادنہیں ہوتی۔ اس کے بعد اگر کوئی قوم ایمان نہ لائے تو وہ دنیا میں خدا کے عذاب کی مستحق ہوجاتی ہے اور آخرت میں عذر و معذرت کے سارے دروازے اس کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں:

رُسُلاً مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ

ہم نے یہ سارے رسول خوش خبری دینے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے، تاکہ ان کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔ (النساء:۱۶۵)

اسی انذار وتبشیر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے رسول محمد ﷺ نے اہلِ کتاب پر بھی اللہ کی طرف سے حجت تمام کی۔ ارشاد ہے:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ ؗ فَقَدْ جَآءَ كُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (المائدۃ:۱۹)

اے اہل کتاب! ہمارا یہ رسول تمھارے پاس آپہنچا، جو دین کی تعلیم تمھیں صاف صاف دے رہا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت سے بند تھا، تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ سو اب یہ ڈرانے اور خوش خبری دینے والا تمھارے پاس آگیا۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس اتمامِ حجت کے لیے ضروری ہے کہ انذار وتبشیر کا فرض اس طرح انجام دیا جائے کہ مخاطب کے شبہات رفع ہوجائیں، اس کے دماغ کی گرہیں کھلتی چلی جائیں اور حق اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ سامنے آجائے، کسی دلیل کی بنا پر اسے رد نہ کیا جاسکے اور مخالف جی سکے تو صرف ضد اور ہٹ دھرمی کے سہارے جی سکے۔ اس کام کے لیے محض سطحی علم و فہم اور روایتی معلومات کافی نہیں ہیں، بلکہ داعی کو تفقہ سے بہرہ مند ہونا

چاہیے۔ تفقہ، دین میں گہری بصیرت حاصل کرنے اور اس کی روح کو پانے کا نام ہے۔ یہ دولت ان خوش قسمت انسانوں کو ملتی ہے، جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و برکت کا خاص نزول ہوتا ہے۔ قرآن کے نزدیک انذار وتبشیر کے لیے ہر بستی میں اصحابِ فقہ کا پایا جانا ضروری ہے۔ ارشاد ہے:

فَلَوْلاَ نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ○

ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکلتے، تاکہ دین میں تفقہ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنی قوم کے درمیان انذار کرتے کہ وہ بھی غیر اسلامی روش سے پرہیز کرتے۔ (التوبۃ: ۱۲۲)

یہ ہے انذار وتبشیر کا عمل جو اپنی فطرت کے لحاظ سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ آدمی اپنے اندر تفقہ فی الدین پیدا کرے۔ اسے 'جہاد کبیر' بھی کہا گیا ہے۔ فرمایا:

وَ لَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا○ فَلاَ تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا○

اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے تو اے نبیؐ! آپ کافروں کی بات نہ مانئے اور اس قرآن کے ذریعے ان سے جہادِ کبیر کیجیے۔ (الفرقان: ۵۱،۵۲)

مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہر بستی میں ایک نذیر آتا اور لوگوں کو ان کے انجام سے آگاہ کرتا، جیسا کہ اس سے پہلے ہوتا رہا ہے، لیکن اب اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ پورے عالم کے لیے ایک ہی نذیر ہو اور ایک ہی کتاب ہو، لہٰذا اے محمد ﷺ! آپ کفر و باطل کے مقابلہ میں جمے رہیں اور اس کتاب کے ذریعے جہاد کبیر کرتے رہیں[1]

یہ سورۂ فرقان کی آیات ہیں اور سورۂ فرقان مکہ میں نازل ہوئی۔ مکہ میں تلوار سے جہاد نہیں تھا، بلکہ کفر و شرک کے خلاف دلائل کی جنگ لڑنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جہاد تلوار ہی سے نہیں ہوتا، بلکہ دلائل اور براہین سے بھی ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے:

---

[1] رازی، تفسیر کبیر جلد ۱۲، جزء ۲۴، ص ۸۶،۸۷

جاھدوا المشر کین باموالکم و انفسکم و السنتکم[1]
مشرکین سے جہاد کرو، اپنے اموال سے، اپنی جانوں سے اور اپنی زبانوں سے۔

امام راغبؒ فرماتے ہیں: جہاد ہاتھ سے بھی ہوتا ہے اور زبان سے بھی۔ علامہ رشید رضا مصریؒ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے:

والجھاد بالاَلسنة اقامة البرھان والحجة[2]
زبان سے جہاد یہ ہے کہ دلیل اور حجت قائم کردی جائے۔

دلائل کی یہ جنگ مکہ میں اس طرح لڑی گئی کہ قرآن کے مخالفین نہتے ہوتے چلے گئے۔ اس نے بار بار اعلان کیا:

قُلۡ هَلۡ عِنۡدَ کُمۡ مِنۡ عِلۡمٍ فَتُخۡرِجُوۡهُ لَنَآ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا تَخۡرُصُوۡنَ ○ (الانعام:۱۴۸)
ان سے کہو کہ کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے جسے تم ہمارے سامنے پیش کرسکو۔ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔

اس چیلنج کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ جہاد زبردست علمی و فکری تیاری کے بغیر نہیں لڑا جاسکتا۔ اس کے لیے اس قدر مسلح ہونا پڑے گا کہ باطل کے ہر وار کو روکا جاسکے بلکہ جوابی حملہ کرکے اسے پسپا کر دیا جائے۔

شہادت علی الناس

اس کام کے لیے 'شہادت علی الناس' کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے۔ شہادت علم کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ علم کے بغیر آپ شہادت نہیں دے سکتے۔ پھر علم بھی ایسا جس میں قطعیت ہو، جس میں شک کی کوئی گنجائش نہ ہو، جس میں حالات کا آپ نے پوری تفصیل اور باریک بینی سے مطالعہ کیا ہو، جس میں آپ کو صاف معلوم ہو کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون؟ آپ کے علم اور مطالعہ میں ذرا بھی غلطی ہو یا آپ ریب اور

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجھاد، باب کراھیة ترک الغزو۔ نسائی، کتاب الجھاد، باب وجوب الجھاد۔ دارمی، کتاب الجھاد، باب فی جھاد المشرکین باللسان والید

[2] تفسیر المنار:۱۱/ ۳۰۶

تذبذب کے شکار ہوں تو شہادت کا حق ٹھیک ٹھیک ادا نہیں کر سکتے۔ اللہ کے رسول اس کے دین کے شاہد بن کر دنیا میں آتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کے درمیان اس طرح شہادت دیتے ہیں کہ حق پوری طرح واضح ہو جاتا ہے اور باطل کی ایک ایک خامی ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس شہادت کے بعد بھی قوم حق کو قبول نہ کرے اور باطل سے چمٹی رہے تو اس کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے:

اِنَّآ اَرۡسَلۡنَآ اِلَيۡكُمۡ رَسُوۡلاً شَاهِدًا عَلَيۡكُمۡ كَمَآ اَرۡسَلۡنَا اِلٰى فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلاً ○ فَعَصٰى فِرۡعَوۡنُ الرَّسُوۡلَ فَاَخَذۡنٰهُ اَخۡذًا وَّبِيۡلاً ○ (المزمل: ۱۵،۱۶)

ہم نے تمھاری طرف ایک رسول تم پر شاہد بنا کر بھیجا ہے، جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا۔ فرعون نے رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔

اللہ کے رسول اس کے دین کی جو شہادت اس دنیا میں دیتے ہیں اسی کی بنیاد پر قیامت کے روز بھی قوموں کا فیصلہ ہوگا۔ وہاں ان کے مخالفین کو معلوم ہو جائے گا کہ دلیل اور حجت اللہ کے رسولوں کے ہاتھ میں تھی اور وہ بے دلیل ان سے لڑ رہے تھے:

وَيَوۡمَ نَبۡعَثُ مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيۡدًا ثُمَّ لاَ يُؤۡذَنُ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَلاَ هُمۡ يُسۡتَعۡتَبُوۡنَ ○ (النحل: ۸۴)

یاد کرو اس دن کو جب کہ ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے۔ پھر جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا انھیں نہ تو عذر پیش کرنے کی اجازت دی جائے گی اور نہ ان سے اللہ کو راضی کرنے کی فرمایش کی جائے گی۔

شہادت علی الناس کا جو فرض اللہ کے رسولوں نے انجام دیا وہی اب اس امت کو انجام دینا ہے۔ اس وقت ایک طرف اللہ کا نازل کردہ دین ہے، دوسری طرف اس کے بالمقابل انسانوں کے خود ساختہ نظریات ہیں۔ اسے ثابت کرنا ہوگا کہ اللہ کا دین ہی دین حق ہے، اس کے علاوہ دنیا میں ہر سو جو افکار و نظریات پھیلے ہوئے ہیں وہ سارے کے سارے باطل افکار و نظریات ہیں۔ اس کے لیے دین حق کی خوبیوں کے ساتھ ان نظریات کی کمزوریوں اور خامیوں سے واقف ہونا اور ٹھیک ٹھیک اسے آج کے اسلوب

میں پیش کرنا ضروری ہے:

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ وَ تَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ○ (الحج:۷۸) تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادتِ حق کا فرض ادا کیا اور ایک امت اس مقصد کے لیے کھڑی کردی۔ اب یہ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا کے سامنے اللہ کے دین کے حق ہونے کا ثبوت فراہم کرے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اس مقصد کے لیے 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے۔ معروف ومنکر کے اندر مثبت اور منفی طریقہ سے پورا دین آجاتا ہے۔ 'معروف' افکار و اعمال کا وہ نظام ہے، جسے کتاب وسنت کی سند حاصل ہے، جن افکار و اعمال کو یہ سند حاصل نہیں ہے، انھیں 'منکر' کہا جاتا ہے۔ دین کی دعوت و تبلیغ سے لے کر اسلامی ریاست کے قیام اور اس کی کارگزاری (Function) تک سب ہی کچھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں شامل ہے۔ اس کے لیے دین کا گہرا اور وسیع علم ہی کافی نہیں ہے بلکہ مخالفِ دین افکار ونظریات سے بھی بھرپور واقفیت ضروری ہے۔ ورنہ یہ طویل سفر طے نہیں ہوسکتا۔[1]

اظہارِ دین

اب ایک اور اصطلاح 'اظہارِ دین' کو لیجیے۔ قرآن مجید نے اظہار دین کا اعلان کیا اور یہ اعلان پورا ہوا۔ اظہارِ دین کے دو پہلو ہیں: ایک سیاسی سطح پر اس کا غالب ہونا، دوسرا دلائل کے ذریعے اس کا چھا جانا۔ سیاسی طور پر دین اسی وقت غالب ہوسکتا ہے جب کہ دلائل سے اس کا حق ہونا ثابت ہوجائے۔ علمی اور استدلالی کوششوں ہی سے

---

[1] اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'معروف ومنکر' مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

سیاسی غلبہ کی راہیں کھلتی ہیں۔ بعض اوقات کسی نظریہ کے سیاسی غلبہ کو اس کے علمی غلبے سے الگ کر کے دیکھا جاتا ہے، لیکن یہ ایک فکری غلطی ہے۔ کسی فرد یا گروہ کے سیاسی اقتدار تک پہنچنے اور کسی نظریہ کے اقتدار پر آنے میں فرق ہے۔ کوئی فرد یا گروہ مضبوط علمی اور فکری پس منظر کے بغیر بھی اقتدار پر قابض ہوسکتا ہے۔ لیکن نظریہ اپنا زبردست علمی ثبوت چاہتا ہے۔ علمی غلبہ کے بغیر اسے سیاسی غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ جب بھی اسلام کو سیاسی سربلندی حاصل ہوگی اس کی علمی برتری اس سے پہلے قائم ہوچکی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی اپنے پیغمبروں پر جو عنایات ہوتی ہیں، ان میں قرآن مجید نے علم اور حکم کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰىٓ آتَيْنٰهُ حُكْماً وَّعِلْماًؕ (القصص: ۱۴) اور جب وہ پوری جوانی کو پہنچ گیا اور اس کا نشو و نما مکمل ہوگیا تو ہم نے اسے حکم اور علم عطا کیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی یہ دونوں خوبیاں ملی تھیں۔ ارشاد ہے:

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ آتَيْنٰهُ حُكْماً وَّعِلْماًؕ (یوسف: ۲۲) اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے حکم اور علم عطا کیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے بارے میں کہا ہے:

كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا (الانبیاء: ۷۹) ہم نے ان میں سے ہر ایک کو حکم اور علم عطا کیا تھا۔

یہی بات حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں بھی کہی گئی ہے (الانبیاء: ۷۴) علم اور حکم کا ایک ساتھ ذکر کر کے قرآن مجید نے اس گہرے رشتہ کو بیان کیا ہے، جو ان کے درمیان پایا جاتا ہے۔ 'حکم' کے معنیٰ قوت فیصلہ کے بھی ہیں اور فیصلہ کرنے کے بھی۔ فیصلہ کا تعلق قانون اور سیاست سے ہے۔ اس کے ساتھ علم کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ سیاست علم سے وابستہ ہے۔ علم نہ ہو تو انسان کے فیصلے غلطی سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ جہاں انفرادی معاملات سے آگے بڑھ کر قوموں اور گروہوں کی قسمت کا فیصلہ کرنا ہو، بڑے بڑے اجتماعی اور سیاسی اقدامات کرنے ہوں وہاں علم کا کردار بنیادی ہوتا ہے۔

یوں کہنا چاہیے کہ علم کے بغیر اس راہ میں آدمی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی ریاست علم کی بنیاد پر قائم ہوگی اور اس میں اقتدار کا مرکز اہلِ علم ہوں گے۔ قرآن کہتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں اولوالامر ہیں۔ (النساء:۵۹)

اسلام میں 'اولو الامر' وہ ہوں گے، جن کے اندر اجتہاد اور استنباط کی صلاحیت ہوگی۔ یہ صلاحیت تھوڑی بہت معلومات سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لیے وسیع علم اور گہری بصیرت کی ضرورت ہے۔ ارشاد ہے:

وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ	جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے امن کی ہو یا خوف کی تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں۔ حالاں کہ اگر یہ اسے رسول اور اپنے 'اولو الامر' تک پہنچائیں تو اس کی حقیقت تک پہنچ جائیں وہ لوگ جو ان میں تحقیق کر سکتے ہیں۔ (النساء:۸۳)

بلاشبہ یہ آیت حالتِ جنگ سے بحث کرتی ہے، لیکن جیسا کہ علامہ ابوبکر جصاصؒ کہتے ہیں، یہ ہر طرح کے اجتہاد کی دلیل ہے۔ جب جنگی معاملات میں اجتہاد ضروری ہے تو دوسرے معاملات میں بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ دونوں ہی احکامِ الٰہی ہیں[1]

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ احیائے دین کے لیے جو اصطلاحات قرآن مجید میں استعمال ہوئی ہیں، ان کے کتنے وسیع علمی تقاضے ہیں۔ جب تک یہ تقاضے پورے نہیں ہوتے، احیاء دین کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

(سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اکتوبر-دسمبر ۱۹۸۵ء)

❦

---

[1] احکام القرآن: ۲/ ۲۷۱

اقامتِ دین کے لیے علمی تیاری کی اہمیت

اسلام ایک نظام حیات ہے۔ یہ پوری زندگی میں ہماری رہ نمائی کرتا ہے۔ دنیا کے سارے نظام غلط اور باطل ہیں۔ اسلام کے ماننے والوں کی ذمہ داری ہے کہ ان نظاموں کو ختم کرکے اللہ کی اس زمین پر اس کے اس نظامِ حیات کو قائم اور غالب کریں۔ یہی اقامتِ دین ہے۔

اقامتِ دین کا تصور

ایک زمانہ تھا، زیادہ دور کا نہیں، قریب ہی کا کہنا چاہیے، اقامتِ دین کے تصور میں بڑی ندرت تھی۔ غیروں کا ذکر ہی کیا، اپنے بھی بڑی حیرت و استعجاب سے اسے دیکھتے اور سنتے تھے، لیکن اب اس تصور میں پہلی سی ندرت نہیں رہی۔ ماضی قریب کی یہ نامانوس اور اجنبی آواز آج دنیا کے بہت سے گوشوں سے بلند ہورہی ہے۔ یہ نغمہ افراد کی زبانوں پر بھی ہے اور اس کے گرد لوگ مختلف ناموں سے جمع بھی ہورہے ہیں۔

اقامتِ دین کی جدوجہد عملی دلائل کا تقاضا کرتی ہے

اقامت دین محض ایک جذباتی نعرہ نہیں ہے، اسے ہوش و خرد سے خالی وقتی جوش و خروش کا مظاہرہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ ماضی کو زندہ کرنے کی جھوٹی تمنا اور آرزو بھی نہیں ہے، بلکہ یہ باطل نظریات کی آگ میں جلتی ہوئی دنیا کو دینِ حق کے سایے

میں لانے کی ایک سنجیدہ اور منظّم کوشش ہے۔

اقامت دین کی جدّ وجہد کس وقت، کہاں اور کن حالات میں شروع ہوئی؟ اس کا کیا علمی سرمایہ تھا اور اس میں کب کتنا اضافہ ہوا؟ اس کی قدر و قیمت میں حالات کی تبدیلی سے کوئی فرق آیا یا نہیں؟ ان سب سوالات سے اس وقت بحث نہیں ہے، البتہ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس ملک میں اقامتِ دین کی جدّ وجہد کا آغاز اس طرح ہوا کہ اس کے پیچھے جو فکر اور فلسفہ تھا، مضبوط دلائل اور استدلال کی جو زبردست قوت تھی، اس سے وابستہ افراد نے اسے اچھی طرح جذب کیا تھا۔لیکن اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نصب العین کے حق میں جو دلائل فراہم کیے گئے تھے ان سے واقفیت کم ہوتی جارہی ہے۔کم از کم اتنی بات شاید غلط نہ ہوگی کہ یہ دلائل اب ذہنوں میں تازہ نہیں رہے۔ علمی مسائل و مباحث سے جیسے جی گھبراتا ہو اور دامن بچا کر ہم ان سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہوں۔ کبھی کبھی خیال ہوتا ہے اور یہ خیال بے بنیاد نہیں ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے علمی اور فکری تیاری کی اہمیت ہی نگاہوں سے اوجھل ہوتی جارہی ہے اور یہ احساس بھی بہت سے مسائل و مشاغل کے بوجھ تلے دب سا گیا ہے کہ علمی بے سروسامانی کے ساتھ یہ دشوار گزار مہم طے نہیں ہوسکتی۔ حالانکہ کسی نظریہ کو اختیار کرنا اور اس پر ثابت قدم رہنا بڑا جان جوکھم کا کام ہے۔ اس کی جرأت و ہمت اور قوت و صلاحیت علم ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ دنیا نظریات کا ایک جنگل ہے۔ آدمی علم ہی کی بنیاد پر ان میں سے کسی کا انتخاب کرتا ہے۔ جب اس کا علم پختہ ہوکر ایمان میں تبدیل ہوجاتا ہے تو اس کے اندر پہاڑ کی سی ثابت قدمی اور استقامت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑنے کے لیے بھی تیار ہوجاتا ہے۔ علم نہ ہو تو آدمی کسی ایک متعین فکر پر جم نہیں سکتا۔ مخالف افکار کا ایک ہی ریلا اسے اپنے ساتھ بہالے جائے گا۔ ذرا ایک قدم اور آگے بڑھ کر ایک داعی کی حیثیت سے سوچیے تو علم کی ضرورت اور اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ علم داعی کی ایک ابتدائی اور بنیادی ضرورت ہے، اس لیے کہ علم ہی سے کارِ دعوت کا آغاز ہوتا

ہے۔ کسی نظریہ کو دنیا کے سامنے پیش کرنے اور اسے اختیار کرنے کی دعوت دینے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اس نظریہ کو نہ صرف یہ کہ اچھی طرح سمجھتا ہو جس کی وہ دعوت دے رہا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ان علمی اور فکری بنیادوں سے بھی اسے واقف ہونا چاہیے جن پر وہ نظریہ قائم ہے۔ اس راہ میں جتنا علمی سرمایہ داعی کے پاس ہوگا اتنا ہی وہ آگے بڑھے گا اور جہاں یہ سرمایہ ختم ہوگا اس کی پیش قدمی رُک جائے گی، بلکہ اس بات کا ڈر ہے کہ وہ اس سفر ہی سے واپس نہ لوٹ آئے اور ہمت ہار کر بیٹھ جائے۔ علم کی تھوڑی سی متاع سے دعوت کا پر پیچ اور لمبا سفر طے کرنا معجزہ ہے اور معجزے ہمیشہ ظاہر نہیں ہوتے۔

مخاطب کی علمی سطح کے مطابق گفتگو

کسی کو ہم سے آپ سے عقیدت و محبت ہو تو ممکن ہے کہ وہ ہماری بات بے دلیل بھی مان لے، لیکن دنیا کا عام قاعدہ یہی ہے کہ دعویٰ دلیل سے مانا جاتا ہے اور دعویٰ جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے لیے اتنی ہی بڑی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ دعوت و تبلیغ کے لیے داعی کی علمی سطح مخاطب کی علمی سطح کے برابر بلکہ اس سے برتر ہونی چاہیے۔ تھوڑی بہت معلومات کے ذریعہ ناخواندہ یا کم خواندہ افراد کے درمیان تو کسی نہ کسی درجہ میں دعوتی کام انجام دیا جاسکتا ہے، لیکن پڑھے لکھے طبقے کو خطاب کرنے کے لیے اسی تناسب سے علمی تیاری کرنی ہوگی۔ اس کے لیے اسی معیار کے دلائل فراہم کرنے ہوں گے اور اسلوبِ بیان بھی اتنا ہی علمی اختیار کرنا ہوگا۔ کسی پڑھے لکھے شخص کو داعی اپنی کم تر علمی سطح پر لاکر بات نہیں کرسکتا، اس کے لیے خود اسے اٹھ کر اپنے مخاطب کی سطح پر پہنچنا ہوگا۔ اس کے بغیر وہ اس کی فکری عظمت کو کبھی نہیں محسوس کرے گا اور اس کی باتوں کو اس قابل نہیں سمجھے گا کہ ان کی طرف توجہ دی جائے۔ ہماری علمی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ شاید یہ بھی رہی ہے کہ ہم نے علمی لحاظ سے کم تر درجہ کے لوگوں کو اپنا مخاطب بنانا شروع کردیا، اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ انسان اپنے

سے کم تر درجے کے لوگوں کو لاجواب کر کے فریبِ علم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہی ساری دنیا کی ذہنی سطح ہے اور وہ اپنے دلائل کے زور سے ہر ایک کو زیر کر سکتا ہے۔ یہیں سے اس کا علمی زوال ہونے لگتا ہے۔ علمی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ان افراد سے خطاب کی تیاری کرے جو علم و فکر میں اس سے اونچی حیثیت کے مالک ہیں۔ داعی کو اپنے مخاطبین کے درمیان فکری لحاظ سے اتنے بلند اور محفوظ مقام پر ہونا چاہیے کہ اس پر کسی طرف سے حملہ آور ہونا آسان نہ ہو اور وہ چاروں طرف اپنی یلغار جاری رکھ سکے۔ اس فکری استحکام کے بغیر دنیا میں کوئی بھی ذہنی و فکری انقلاب نہیں آسکتا۔

ہماری علمی فضا میں تبدیلی کا سبب؟

سوال یہ ہے کہ جو علمی فضا ہم نے بنائی تھی اب وہ کیوں بدل گئی اور جو فکری رجحان پیدا کیا تھا وہ کم زور کیوں پڑ گیا؟

اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ ہم نے اپنے سفر کے آغاز میں بعض اہم علمی اور فکری، موضوعات سے بحث کی۔ دور جدید نے جو سوالات چھیڑے تھے ان کے جوابات دیے اور علمی دنیا میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا، نئے نئے موضوعات ہم نہیں اپنا سکے اور پچھلے مواد ہی کو دہرانے، اسے آسان کرنے اور اس کی تشریح و تفسیر کرنے میں لگ گئے۔ مواد کی تکرار اتنی زیادہ ہونے لگی کہ پڑھنے والوں میں اکتاہٹ پیدا ہوگئی۔ اس طرح جو علمی رجحان پیدا ہوا تھا جب اسے مناسب غذا نہیں ملی اور اس کے نشو و نما اور پرورش کا سامان نہیں فراہم کیا گیا تو وہ مرجھا کر رہ گیا۔

علمی میدان میں کام جاری ہے

یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ علمی محاذ پر جو چوکھی جنگ ہم نے چھیڑی

تھی وہ جاری نہیں رہ سکی اور جس تیزی سے ہم آگے بڑھ رہے تھے اس میں فرق آ گیا۔ اس کے اسباب یقیناً ہمیں معلوم کرنے چاہئیں اور انھیں دور کرنے کے لیے نئے سرے سے اور نئے عزم و حوصلہ سے کوشش بھی ہونی چاہیے۔ اپنی سست روی کے اس اعتراف کے باوجود یہ کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے کہ اس دوران میں بالکل علمی خلا نہیں رہا ہے، بعض جدید موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں، قدیم موضوعات پر نیا مواد بھی پیش کیا گیا ہے، جن مسائل پر صرف مجمل سے اشارے کیے جا سکے تھے ان کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں، جو باتیں دلائل کی محتاج تھیں ان کو مدلّل اور مبرہن کیا گیا ہے اور جن گوشوں کو مزید نمایاں اور اجاگر کرنے کی ضرورت تھی ان کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے بعض نئے افق ابھر کر سامنے آتے ہیں، جن پہلوؤں کی طرف توجہ نہیں تھی یا کم تھی ان کی طرف توجہ ہوتی ہے اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔اس کام کو نظر انداز کرنا اور اس سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھانا ایک طرح کا علمی نقصان ہے اور اقامت دین کے علم بردار کو کسی قیمت پر یہ نقصان نہیں برداشت کرنا چاہیے۔

اسلام کے لیے ہر زمانے میں دلائل کا فراہم کرنا ضروری ہے

بعض اوقات اس طرح کا رجحان بھی سامنے آتا ہے کہ اسلام کو علمی و فکری طور پر تو ثابت کیا جا چکا ہے، اب صرف عملاً اسے قائم کرنے کا کام رہ گیا ہے، لیکن یہ خام خیالی ہے۔ یہ دنیا متحارب نظریات کی آماج گاہ ہے۔ نظریات کی جنگ بڑی سخت ہوتی ہے، جو ایک مرتبہ کی کامیابی کے ساتھ ختم نہیں ہوجاتی، بلکہ یہاں روزہ بروز نت نئے حملے ہوتے رہتے ہیں۔ کسی بھی نظریہ کو زندہ رہنے کے لیے اپنے وجود ہی کا نہیں، بلکہ اپنی قوت و توانائی کا مسلسل ثبوت فراہم کرنا ہوتا ہے۔ جو نظریہ قدم قدم پر یہ ثابت نہ کر سکے کہ وہ دوسرے نظریات پر غالب آ سکتا ہے، مخالف نظریات آسانی سے اپنی شکست اور پسپائی کا اعلان کر کے اس کی حکومت اور فرماں روائی کبھی قبول نہیں کریں

گے۔ بہت سے نظریات اس دنیا میں ابھرتے رہے ہیں، لیکن جب نظریات کی کشمکش میں وہ شکست کھا گئے تو انھیں بے جان اور مردہ سمجھ کر تاریخ کے اوراق میں دفن کردیا گیا۔ یہاں کسی بھی نظریہ کا علم بردار ہر آن فکری کشمکش سے دوچار رہتا ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لیے اس سے غافل ہوجائے تو مخالف نظریات کے لیے اسے میدان خالی کرنا پڑے گا۔ تاریخ اس معاملہ میں بڑی بے رحم واقع ہوئی ہے۔ نہ پہلے اس نے کسی کے ساتھ رعایت کی اور نہ اب کرے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم جو فکری مہم طے کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے بھرپور علمی تیاری کی ضرورت ہے۔ یہ تیاری مذہب، فلسفہ، اخلاق اور قانون بہت سے پہلوؤں سے ہونی چاہیے۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ غلط سے غلط اور باطل سے باطل نظریات بھی علم کے زور اور قوت سے بعض اوقات چھا جاتے ہیں اور اس وقت اس طرح کے نظریات دنیا پر عملاً چھائے ہوئے بھی ہیں۔ ہمارے پاس دین حق ہے۔ اگر اسے آج کے علمی معیار کے لحاظ سے پیش کیا جائے تو وہ وقت زیادہ دور نظر نہیں آتا کہ دنیا سے باطل نظریات کی تاریکی چھٹ جائے اور دین حق کی روشنی چاروں طرف پھیل جائے۔ اگر اس میدان میں ہماری تیاری مکمل نہ ہو تو ڈر ہے کہ ہم اپنی کم زور وکالت کی وجہ سے اللہ کے دین کی حقانیت نہ ثابت کرسکیں اور دنیا محض اس وجہ سے اسے ناقابلِ التفات سمجھ کر رد کردے کہ ہمارے پاس اس کے حق میں مضبوط دلائل نہ تھے۔ یہ نقصان کتنا بڑا نقصان ہوگا، ہمارا بھی اور پوری نوع انسانی کا بھی؟ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نقصان سے ہمیں محفوظ رکھے۔

(ماہ نامہ زندگی نو، نئی دہلی، اگست ۱۹۸۶ء)

☙❧

اسلامی علوم میں تحقیق کا طریقۂ کار

عام طور پر علوم کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک کو سماجی علوم (Social Sciences) اور دوسرے کو طبیعی علوم (Physical Sciences) کہا جاتا ہے۔ امت مسلمہ کی علمی تاریخ میں ان دونوں طرح کے علوم کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہاں صرف سماجی علوم کا ذکر ہے۔

تحقیق کی دو قسمیں

تحقیق اور ریسرچ کے کچھ اصول و آداب ہیں۔ یہ گو نئے نہیں ہیں، لیکن ان کی پابندی اور اہتمام اب زیادہ ہو رہا ہے۔ اسلامی علوم میں ایک تحقیق تو وہ ہے جسے آج کی اصطلاح میں ایڈیٹنگ (Editing) کہا جاتا ہے۔ تحقیق کی دوسری قسم وہ ہے جسے طبع زاد یا (Original Work) کہنا چاہیے۔ یہ دونوں کام اسلامی تاریخ میں شروع سے ہوتے رہے ہیں۔

پہلی قسم (ایڈیٹنگ)

ایڈیٹنگ کسی مخطوطہ کی بھی ہوسکتی ہے اور مطبوعہ کتاب کی بھی۔ منتشر تحریروں کی جمع و ترتیب کو بھی ایڈیٹنگ کہا جاتا ہے۔ اس میں مصنف کے حالات، اس کا ماحول، زمانۂ تصنیف، تصنیف کے محرکات اور اس کے مآخذ سے بحث کی جاتی ہے، اس کے

مختلف نسخوں کا موازنہ ہوتا ہے، اغلاط کی تصحیح کی جاتی ہے، حسب ضرورت اجمال کی تفصیل اور ابہام کی توضیح ہوتی ہے ۔ جدید جامعات میں اس کام کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور اس پر ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی جاتی ہے۔

مشکوٰۃ المصابیح

اسلامی تاریخ میں ایڈیٹنگ کی مثالیں بہ کثرت موجود ہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال حدیث کی مشہور کتاب 'مشکوۃ المصابیح' ہے۔ مشہور محدث امام حسین بن مسعود بن فراء بغوی (م ۵۱۰ھ) نے حدیث کا ایک جامع مجموعہ 'مصابیح السنہ' کے نام سے مرتب کیا۔ اس کے ہر باب میں دو فصلیں قائم کیں۔ مقدمہ میں صراحت کردی کہ پہلی فصل میں بخاری اور مسلم کی احادیث ہیں، جنھیں انھوں نے صحاح کا نام دیا اور دوسری فصل دیگر کتب حدیث (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی وغیرہ) کی روایات پر مشتمل ہوگی، جنھیں وہ حسان کہتے ہیں۔ یہ مجموعہ اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے کافی مقبول ہوا۔ آٹھویں صدی ہجری میں خطیب تبریزی (م ۷۴۱ھ) نے اس کتاب کی بنیاد پر 'مشکوٰۃ المصابیح' مرتب کی، جو ایک لحاظ سے اس کی جدید ترتیب وتہذیب ہے۔ مصابیح السنہ کے ذریعہ یہ معلوم کرنا دشوار تھا کہ کون سی حدیث کس کتاب میں یا کن کتبِ حدیث میں آئی ہے؟ صاحب مشکوٰۃ المصابیح خطیب تبریزی نے اس امر کی نشان دہی کی کہ پہلی فصل میں کون سی روایات متفق علیہ ہیں اور کون سی احادیث صرف بخاری یا مسلم میں ہیں۔ کوئی حدیث پہلی فصل میں درج ہونے کے باوجود ان دونوں کتابوں میں نہیں ملی تو اس کا بھی ذکر کردیا ہے۔ اسی طرح دوسری فصل کی روایات کے بارے میں صراحت کی ہے کہ کون سی حدیث کن کتب میں آئی ہے۔ چند ایک احادیث کے ذیل میں یہ بھی کہا ہے کہ یہ مشہور کتب حدیث میں نہیں ملی ہیں، مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ کہیں احادیث کی تکرار ہوئی ہے تو اسے حذف کیا ہے، کہیں حدیث مختصر ہے تو اسے مکمل نقل کیا ہے، کہیں بغوی

کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ نہیں ملے ہیں تو جن الفاظ میں وہ مروی ہے ان الفاظ میں اس کا اندراج کیا ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے تقریباً ہر باب میں ایک تیسری فصل کا اضافہ کیا ہے، جس میں موضوع سے متعلق بعض ان روایات کا اضافہ کیا ہے جو ان دونوں فصلوں میں نہیں آئی ہیں۔ امام بغوی کی کتاب 'مصابیح السنہ' کی احادیث کی تعداد چار ہزار سات سو انیس (۴۷۱۹) ہے۔ خطیب نے اس فصل کے ذریعہ ایک ہزار پانچ سو گیارہ (۱۵۱۱) روایات کا اضافہ کیا ہے۔ اس حذفہ و اضافہ کے بعد اب مشکوٰۃ المصابیح کی روایات کی تعداد چھ ہزار دو سو چورانوے (۶۲۹۴) ہے۔ [۱]

خطیب نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ کتاب میں جن صحابۂ کرام اور تابعینِ عظام کے حوالے سے احادیث روایات کی گئی ہیں یا کتاب میں جن ائمہ اور محدثین کا ذکر ہے ان سب کے حالات 'الاکمال فی اسماء الرجال' کے نام سے جمع کردیے ہیں۔ مشکوٰۃ المصابیح کو ایک جامع مجموعۂ حدیث ہونے کی وجہ سے کافی شہرت حاصل ہوئی، اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔

اس طرح کی ایڈیٹنگ کے کام حدیث، فقہ اور علم کلام کے مختلف میدانوں میں ہوتے رہے ہیں۔ مختلف علمی کتابوں پر جو حواشی لکھے گئے ان کی نوعیت بھی درحقیقت یہی ہے۔ آج یہ کام زیادہ ترقی کر گیا ہے اور سائنٹفک ہوگیا ہے۔ عرب علماء اس معاملہ میں کافی آگے ہیں۔ اس سے کتابیں بہتر شکل میں سامنے آرہی ہیں اور ان سے استفادہ آسان ہورہا ہے۔

دوسری قسم (طبع زاد تحریر)

تحقیق اور ریسرچ کی دوسری قسم وہ ہے جس میں کسی موضوع پر طبع زاد

---

[۱] ہندوستان کے نام ور عالم، محدث، مفسر اور مؤرخ نواب سید صدیق حسن قنوجیؒ کے صاحب زادے سید نور الحسن قنوجیؒ نے مشکوٰۃ کے ابواب میں ایک چوتھی فصل کا اضافہ کیا اور اس کا نام 'الرحمۃ المھداۃ الی من یرید زیادۃ العلم علی احادیث المشکوٰۃ' رکھا۔ اس کی تکمیل ۱۳۰۱ھ میں ہوئی اور اس مستقل تصنیف کی حیثیت سے مکتبہ فاروقی دہلی سے شائع ہوئی۔

(Original) کام ہوتا ہے۔ تحقیق کے میدان میں اس کی بنیادی اہمیت ہے۔ اس سے علم کی راہ میں پیش قدمی ہوتی ہے اور نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔

جو لوگ اس نوع کی ریسرچ کرنا چاہیں انھیں اس بات کی تعلیم دی جاتی ہے کہ موضوع کے انتخاب میں کن باتوں کو پیش نظر رکھا جائے؟ اس کا خاکہ (Synopsis) کیسے تیار کیا جائے؟ مواد کس طرح پیش کیا جائے؟ ترتیب کیا ہو؟ مآخذ اور حوالے کس طرح دیے جائیں؟ اولین اور ثانوی مآخذ کو کس طرح استعمال کیا جائے؟ زبان و بیان میں کن امور کا خیال رکھا جائے؟ اسی طرح یہ بات بھی بتائی جاتی ہے کہ تحقیق میں غیر جانب داری اختیار کی جائے اور حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

اہل علم اپنی تحقیقات میں ان اصولوں و آداب کا خیال رکھتے ہیں۔ بعض تحقیقات اس معیار پر شاید پوری نہ اترتی ہوں، لیکن اپنے مواد، معلومات اور پیش کش کے لحاظ سے وہ کسی تحقیق سے کم نہیں ہوتیں۔ ان کا اپنا ایک اعلیٰ علمی مقام ہوتا ہے۔ اس طرح کی متعدد تصانیف کی عربی اور اردو میں نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

ایک منفرد اندازِ تحقیق

ریسرچ اور تحقیق کے سلسلے میں یہاں ایک دوسری بات عرض کرنی ہے۔ ایک ریسرچ اور تحقیق یہ بھی ہے کہ آدمی جس موضوع پر لکھنا چاہے، اس کا وسیع مطالعہ کرے، اس موضوع سے متعلق موجود ذخیرہ پر اس کی گہری نظر ہو اور اس کی روشنی مین وہ اپنا نقطۂ نظر پیش کرے۔ اس طرح کے کام کو آج کل کی اصطلاح میں شاید ریسرچ نہ کہا جائے، لیکن متعدد پہلوؤں سے وہ موجودہ ریسرچ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور بعض اوقات حوالہ اور سند کا کام دیتا ہے۔ اس کی مثال حضرت شاہ ولی اللہؒ کی 'حجۃ اللہ البالغۃ' اور ابن خلدون کا مقدمہ ہے۔

حجۃ اللہ البالغۃ

حضرت شاہ والی اللہؒ (م ۱۱۷۶ھ) نے حجۃ اللہ البالغۃ میں حکمتِ دین اور

اسرارِ شریعت سے بحث کی ہے۔ انھوں نے دیباچۂ کتاب مین بیان کیا ہے کہ یہ بالکل نیا موضوع نہیں ہے۔ امام غزالیؒ، محدث خطابیؒ اور علامہ عزالدین بن عبد السلامؒ جیسے اہل علم نے اس کی طرف توجہ کی ہے اور احکامِ دین کی مصالح اور حکمتیں بیان کی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسے مستقل موضوع بنایا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے اس کتاب کا آغاز الٰہیات سے کیا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ ابداع (بغیر کسی مادہ کے تخلیقِ عالم) خلق (مادہ سے مخلوقات کو پیدا کرنا)، تدبیر (عالم کو ایک نظام کے تحت چلانا) جیسے مباحث کے علاوہ عالمِ مثال، ملأ اعلیٰ، ملائکہ، حقیقتِ نبوت، حقیقتِ روح، انسان کو شریعت کا مکلّف کیوں بنایا گیا؟ جیسے موضوعات بھی داخل ہیں۔ سماجی علوم میں ارتفاقات (انسانی ضروریات اور ان کا انتظام) سیاستِ مدنیہ، سیاست ملیہ، انسان اور دوسری مخلوقات کا فرق، سعادت وشقاوت جیسی بحثیں ہیں۔

حضرت شاہ صاحب سے پہلے بھی اس طرح کے بعض مسائل زیر بحث رہے ہیں۔ شاہ صاحب ان سے پوری طرح واقف تھے، لیکن انھوں نے کسی فلسفی اور متکلم کے حوالہ سے گفتگو نہیں کی ہے، بلکہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ انھوں نے نئے مباحث بھی چھیڑے ہیں اور ان سب کو قرآن و حدیث کی روشنی میں نیا رخ دینے کی کوشش کی ہے۔

شاہ صاحب کی اس کتاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اصولی مباحث کے ساتھ پورے نظامِ شریعت سے بحث کی ہے اور ان کی حکمت اور معنویت بیان کی ہے۔ اس میں ایمانیات، ارکانِ اسلام، عبادات، احسان کی کیفیت، معیشت، بیع وتجارت، معاشرت، تدبیرِ منزل، سیاست اور خلافت جیسے تمام موضوعات کا احاطہ کیا ہے ۔ آخر میں سیرتِ رسولؐ کا ذکر ہے۔ اسلامی کتب خانہ میں اس نوع کی جامع تصنیفات کم ہی ہوں گی۔ نظامِ شریعت کی بحث انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی بنیاد پر کی ہے، لیکن ان کے حوالے نہیں دیے ہیں۔ بحث کے شروع میں اس قدر کہا

ہے کہ ان کے پیش نظر کتبِ حدیث میں بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی رہی ہیں۔ ان کے علاوہ کسی اور کتاب سے ضمناً ہی کوئی روایت اخذ کی ہے۔ (جلد اول، ص: ۳۰۱)۔ لیکن خیال ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے الفاظِ حدیث زیادہ تر مجموعۂ حدیث 'مشکٰوۃ المصابیح' سے لیے ہے، جس کے ابواب کی پہلی فصل میں بخاری اور مسلم کی احادیث ہیں اور دوسری اور تیسری میں دیگر کتاب صحاح اور بعض دیگر کتبِ حدیث کی روایات ہیں۔

حوالوں کی عدم موجودگی کے باوجود یہ ایک طبع زاد (Original) علمی کاوش ہے۔ حکمتِ دین کی تفہیم میں اس نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ یہ ریسرچ کے عام انداز سے گومختلف ہے، لیکن اس کے باوجود اپنے موضوع پر مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی اس کی یہ حیثیت باقی رہے گی اور اس سے استفادے کا سلسلہ جاری رہے گا۔

مقدمہ ابن خلدون

یہی حال ابن خلدون (م ۸۰۸ھ) کا ہے۔ اس نے پوری دنیا کی تاریخ لکھی، خاص طور پر عرب، فارس، روم اور افریقہ کو پیش نظر رکھا۔ اس نے کتاب پر جو مقدمہ لکھا وہ فن تاریخ پر بے نظیر اور ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابن خلدون کو فلسفۂ تاریخ کا بانی کہا جاتا ہے، اس نے یہ کتاب ایک طویل مطالعہ اورغوروفکر کے بعد لکھی ہے۔ وہ اپنے منفرد طرزِ تحریر کی وجہ سے بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ اس نے تاریخ نویسی کے اصول و آداب ہی بیان نہیں کیے، بلکہ اس میدان میں واقعات کو جس طرح غلط رخ دیا جاتا ہے اور حقیقت کو افسانہ بنایا جاتا ہے اس کی بھی نشان دہی کی اور اس کے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔

ابن خلدون نے مقدمہ میں جغرافیۂ عالم، مختلف ممالک کی آبادیاں، ان کی نفسیات، آب و ہوا کے اثرات، بدویت و حضارت (دیہی اور شہری زندگی) قومی و قبائلی عصبیت اور اس کے اثرات، حکومت اور اس کا مزاج، عرب اور غیر عرب کا فرق، قوموں

کا عروج و زوال اور اس کے اسباب، غالب قوموں کا رویہ اور مغلوب قوموں کی نفسیات جیسے سماجی اور عمرانی مسائل پر علمی انداز میں گفتگو کی ہے۔

ابن خلدون نے جن مباحث سے تعرض کیا ہے ان میں امور غیب اور ان سے متعلق اطلاعات ، وحی و نبوت اور خلافت و امامت جیسے نازک مباحث بھی ہیں۔حکومت اور ریاست کے ذیل میں زراعت، تجارت ، کاشت کاروں اور تاجروں کے اخلاق و عادات، صنعت وحرفت ،اہم صنعتیں ، حیاکت و خیاطت(پارچہ بافی اور سلائی) اور طب جیسی صنعتوں کا ذکر کیا ہے۔اس نے دینی اور دنیوی علوم اور ان کی مختلف اقسام سے بھی بحث کی ہے۔ اس میں علوم القرآن، حدیث اور علم حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم الکلام، تصوف، منطق، ریاضی اور ہندسہ، طریقۂ تعلیم و تدریس جیسے موضوعات شامل ہیں۔

اس طرح ابن خلدون نے اپنے دور کے بیش تر علوم وفنون کا احاطہ کیا ہے۔ اس کے زیادہ تر مباحث طبع زاد اور اس کے وسیع مطالعہ اور گہرے غوروفکر کا نتیجہ ہیں۔ اس نے مختلف مباحث کے ذیل میں علوم وفنون کے ماہرین و متخصصین کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اس میں افلاطون، ارسطواور بوعلی سینا جیسے فلاسفہ بھی ہیں اور مسعودی، واقدی ،طبری اور یاقوت حموی جیسے مؤرخین بھی ۔ اس کے ہاں ادب اور تاریخ کے میدان میں ابوالفرج اصفہانی، جاحظ اور ابن عبد ربہ جیسے اساطینِ علم وادب کا حوالہ بھی ہے اور کتبِ حدیث میں موطاامام مالک، مسند احمد، کتب صحاح اور دیگر کتب حدیث کا بھی مختلف مناسبتوں سے ذکر ہے۔ متکلمین میں ابو الحسن اشعری، غزالی اور رازی جیسے ائمہ کے حوالے ہیں، فقہاء میں ائمہ اربعہ کا ذکر ہے، تفسیر اور شرح حدیث میں قاضی عیاض، زمخشری، شاطبی اور قرطبی وغیرہ کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ دیگر بہت سے اصحاب علم کے حوالوں سے اس نے گفتگو کی ہے۔

ابن خلدون نے حسب ضرورت اس طرح کے حوالے ضرور دیے ہیں۔ گویہ حوالے اس دور کے رواج کے مطابق نامکمل ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کی ناقدانہ

بصیرت ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہے۔ اسی نے اس کے مقدمۂ تاریخ کو علم و ادب کا تاریخی کارنامہ بنایا ہے۔

مولانا مودودی کی علمی کاوشیں

دورِ حاضر کی ایک نمایاں مثال مولانا سید ابو الاعلیٰؒ (۱۹۰۳-۱۹۷۹) کی ہے۔ وہ اسلامیات کے ممتاز عالم اور محقق رہے ہیں۔ انھوں نے مختلف جہات سے اسلامی فکر کی ترجمانی کی ہے اور جدید افکار و نظریات کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ان کی تحریروں کے غیر معمولی اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کا دائرۂ بحث و نظر تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، فلسفہ، معیشت و معاشرت اور سیاست و قانون جیسے متعدد پہلوؤں پر حاوی ہے۔ ان کا اندازِ بحث مخاطب کے لحاظ سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

مولامودودیؒ نے بعض کتابیں اسلام کے عام تعارف کے لیے لکھی ہیں۔ ان میں ان کی مشہور کتاب 'خطبات' کا آسانی سے ذکر کیا جاسکتا ہے۔ دعوتی اور تبلیغی مقاصد کے لیے اس سے بہت بڑے پیمانے پر مسلسل فائدہ اٹھایا جارہا ہے۔ 'رسالۂ دینیات' اصلاً نصابی ضرورت کے تحت لکھی گئی ہے، لیکن اس کا انداز نصابی کتابوں کا سا نہیں ہے البتہ وہ اسلام کا عقلی انداز میں جامع تعارف کراتی ہے۔

'خطبات' اور 'رسالۂ دینیات' اپنے اثرات کے لحاظ سے کسی ریسرچ سے کم نہیں ہیں۔ ان کتابوں سے بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات نے بھی اثر قبول کیا ہے۔ مولانا نے ان کتابوں میں اسلامی عبادات پر بھی بحث کی ہے، لیکن ' اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر' میں اس بحث کو اور آگے بڑھایا ہے۔

مولانا مودودی کے ابتدائی دور کی تصنیفات میں ' اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی' ہے۔ آغازِ کتاب میں انھوں نے تہذیب کے عناصرِ ترکیبی کا ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد تہذیب کی تشکیل میں دنیوی زندگی کا مقصد واضح کیا ہے۔ تہذیب کی تعمیر میں اساسی عقائد و افکار کی اہمیت بیان کی ہے اور پھر تفصیل سے اسلامی عقائد کا عقلی اور نقلی سطح پر اثبات اور غیر اسلامی افکار کی تردید کی ہے۔ اس ضمن میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا جواب بھی دیا ہے۔ اس پہلو سے وہ اسلامی عقائد پر ایک اعلیٰ علمی تصنیف ہے۔

مسلمانوں کا ایک طبقہ جدید افکار و نظریات سے غیر معمولی طور پر متأثر رہا ہے اور مغرب کے سیاسی اور معاشی غلبہ نے اس کے اندر مرعوبیت بھی پیدا کردی تھی۔ اسی مرعوبیت کے ساتھ وہ اسلامی تعلیمات کی تعبیر و تشریح کر رہا تھا۔ مولانا مودودی نے اس ذہن و فکر کا تعاقب کیا، پوری جرأت کے ساتھ اسلام کی صحیح تصویر پیش کی اور اس کی تعلیمات کی حقانیت ثابت کی۔ مولانا کے اس طرح کے مضامین کا مجموعہ 'تنقیحات' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ اس انقلابی اور جرأت مندانہ فکر کا آغاز تھا، جسے بعد میں مولانا نے آگے بڑھایا۔

مولانا مودودی نے اپنے بعض رسائل میں بھی اسلام کو عقلی انداز میں پیش کیا ہے اور غیر اسلامی عقائد و افکار پر نقد و تبصرہ بھی کیا ہے۔ اس ذیل میں 'سلامتی کا راستہ'، 'اسلام اور جاہلیت'، 'دین حق' اور 'اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر' جیسے رسائل کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس نوع کے رسائل کا مجموعہ 'اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصورات' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔

مولانا نے بعض مقالات میں ہیگل، مارکس اور ڈارون جیسے فلسفۂ جدید کے بعض اساطین پر تنقید کی ہے اور اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفہیمات جلد دوم: ہیگل اور مارکس کا فلسفۂ تاریخ اور ڈارون کا نظریۂ ارتقاء۔ اس کا حوالہ مولانا کے ایک اور مضمون 'مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل' میں بھی ملتا ہے) ان تمام مباحث میں غیر اسلامی تصورات پر مولانا کی گرفت نمایاں ہے، اس کے ساتھ وہ اسلام کے وسیع

مطالعہ، اس کے فہم اور اس کی حکمتوں کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔لیکن کوئی بحث حوالہ کے ساتھ نہیں کی گئی ہے۔ اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے غیر اسلامی افکار کو صحیح طریقہ سے نہیں سمجھا، یا اسلام کے فہم و ادراک اور اس کی ترجمانی میں ان سے کوتاہی ہوئی ہے۔ مولانا مودودی نے اپنی بعض تصنیفات میں متعلقہ موضوع پر حوالوں کے ساتھ بحث کی ہے اور اسے مستند بنایا ہے۔ ان میں 'قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں' اور' خلافت وملوکیت' کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔' الجہاد فی الاسلام' میں بھی بحث کا یہ علمی انداز موجود ہے۔ تفہیم القرآن کی آخری جلدوں میں بعض تفسیری اور فقہی مسائل میں بھی حوالوں کا اہتمام ہے۔ مولانا نے بعض مضامین میں بھی حوالوں کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ یہ اگرچہ مروجہ اصول تحقیق کے مطابق نہیں ہے، لیکن اسے حوالوں کے ساتھ گفتگو ہی کہا جائے گا۔

مولانا مودودی در اصل اسلامی اسکالر اور اس کے ترجمان ہیں۔انھوں نے اسلام کا اس کے بنیادی مآخذ سے وسیع مطالعہ کیا ہے۔ اس کے معتبر اور مستند شارحین اور ائمہ محققین سے بھی انھوں نے استفادہ کیا ہے۔ وقت ضرورت وہ قرآن وحدیث کے نصوص اور ان میں بصیرت رکھنے والے ماہرین اور متخصصین کے حوالے بھی فراہم کرتے ہیں۔ بعض اوقات متعدد حوالے بھی دیتے ہیں،تاکہ ان کے موقف کو ذہنی اختراع یا جدتِ فکر نہ سمجھ لیا جائے ۔ اس کی وضاحت ان کی ابتدائی تصنیف ' الجہاد فی الاسلام' میں ملتی ہے۔فرماتے ہیں:

" اس کتاب میں میں نے خصوصیت کے ساتھ اس امر کا التزام کر رکھا ہے کہ کہیں اپنے یا دوسرے لوگوں کے ذاتی خیالات کو دخل نہیں دیا، بلکہ تمام کلّی و جزئی مسائل خود قرآن مجید سے اخذ کر کے پیش کیے ہیں اور جہاں کہیں ان کی توضیح کی ضرورت پیش آئی ہے احادیثِ نبوی، معتبر کتبِ فقہیہ اور صحیح مستند تفاسیر سے مدد لی ہے، تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ آج دنیا کا حال دیکھ کر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی گئی ہے بلکہ جو کچھ کہا گیا

ہے سب کچھ اللہ اور اس کے رسول اور ائمہ اسلام کے ارشادات پر مبنی ہے۔'' (الجہاد فی الاسلام، دیباچہ طبع اول، ص ۱۹)

بعد کی تصانیف میں بھی مولانا نے جہاں حوالوں کے ساتھ گفتگو کی ہے، یہ مقصد ان کے پیش نظر رہا ہے۔

لیکن مولانا مودودی کا یہ انداز غیر اسلامی نظریات و افکار پر تنقید کے سلسلے میں نہیں ہے۔ وہ زیادہ تر ان کا خلاصہ یا اپنا حاصلِ مطالعہ یا پیش کرتے ہیں۔ اس طرح کے مسائل پر مولانا کے ہاں براہ راست حوالے کم ملتے ہیں، کہیں کہیں انسائیکلو پیڈیا جیسے عمومی ماخذ کا حوالہ بھی وہ دیتے ہیں۔

مولانا مودودی نے اسلامی فکر کو اسلام کے عمومی مطالعہ کی روشنی میں پیش کیا ہو، یا حوالوں کے ساتھ گفتگو کی ہو، وہ ایک ماہرِ اسلامیات کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ ان کی کسی بات سے اتفاق ہو یا اختلاف، ان کے علمی مقام اور معیارِ تحقیق سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

(سہ ماہی 'تحقیقات اسلامی' علی گڑھ، اپریل-جون ۲۰۱۳)

☙❧